بشیر صرفی کی شاعری میں مذہبی، رومانوی اور انقلابی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

انجم مبین

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

مئی ۲۰۱۹ء

بشیر صرفی کی شاعری میں مذہبی، رومانوی اور انقلابی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ نگار:

انجم مبین

یہ مقالہ

ایم-فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو ئجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

مئی ۲۰۱۹ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگو ئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **بشیر صرفی کی شاعری میں مذہبی، رومانوی اور انقلابی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ**

پیش کار: انجم مبین رجسٹریشن نمبر: 1383\MPhil/Urdu/F17

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر عابد حسین سیال
نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان
ڈین فیکلٹی آف لینگو ئجز

بریگیڈیئر محمد ابراہیم
ڈائریکٹر جنرل

تاریخ

اقرارنامہ

میں انجم مبین حلیفہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عابد حسین سیال کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ ہی آئندہ کروں گی۔

انجم مبین

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

مئی ۲۰۱۹ء

فہرست ابواب

Abstract

Bashir Surfi is known as a poet, writer and journalist .His profession was journalism and he worked as the editor of different newspapers including the Daily Jang, Daily Hurmat, Daily Haider, a weekly magazine Akhbar-e-Watan. Besides he was the editor of a maganize Iftikhar-e-Asia and also published on English newspaper "The View week".

Bashir Surfi inherited his interest in poetry. His father and grandfather were leadings poets of Arabic and Persian. He belonged to the decade of seven nineteen seventies. He was associated with Halqa-e-Arbab-e-Zouk and also a group of writers in Rawalpindi. Ghulam Rasool Tariq was one of his most significant mentors. His contemporaries included Dr. Rashid Amjad, Waqar Azeem, Safdar Hahsimi, Sarwar Kamran, Ijaz Rahi, Shaban M Anawri and Mansha Yaad.

Bashir Surfi poetry reflects his awareness of his age as well as the dynamic elements of tradition Migration from Kashmir added romance and revolutionary thoughts to his poetry .In addition to these he remained all his life under the strong influence of his religious background.

Bashir Surfi poetic works include hymns in praise of Allah (Hamad) Prophet Muhammad صلی اللہ علیہ وسلم (Naat), odes and poems about Kashmir. Each of the genres he worked upon are different in nature. He, however, different exploited each genre to project his ideas .On the whole his poetry reflects hi telescopic vision. But he never ignores the external environment of his contemporary age. The element of is quite prominent in his poems.

Especially the poems in the background of Kashmir reflect his revolutionary spirit .Besides his poetry reflects his attitude towards others problems and issues of life. His religious imagination is quite visible in the hymns written in praise of Allah and the Prophet صلی اللہ علیہ وسلم .His odes reflect his romantic tendency. Thus his poetry has diverse dimensions. The scope of this dissertation includes the regions includes the regions romantic and revolutionary aspects which contribute to his poetry. These elements are analyzed in order to interpret his poetry.

This dissertation is divided into four chapters as given below:

The first chapter discusses the personality and literary standing of Bashir Surfi .Besides it includes an analysis of Bashir Surfi religious poetry with particular emphasis on his hymns. In addition to these this chapter also analysis the moral aspects of his poetry such as his sense of sensitivity for humanity, his love and brotherhood and his view of social values. The third chapter is an analysis of romantic elements in Bashir Surfi poetry. It discusses his personal as well as social romance reflected in his hopes, dreams, nostalgia, and desire to get rid of troubles of life.

The fourth chapter is a study of revolutionary aspect in Bashir Surfi's poetry. The elements of resistance in this poetry are especially analyzed in the perspective of historical events of the fall of Dhaka, Martial Law and the freedom Movement of Kashmir.

The fifth chapter includes a general analysis along with the findings and recommendations of the researcher.

اظہارِ تشکر

اللہ کے فضل و کرم سے میرا ایم-فل کا مقالہ بعنوان "بشیر صرفی کی شاعری میں مذہبی، رومانوی اور انقلابی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ" پایہ تکمیل کو پہنچا۔ مقالے کی تکمیل کے تمام مراحل میں اساتذہ کرام کی بے لوث مشاورت اور مکمل رہنمائی میرے شامل حال رہی۔ میری اس تحقیق کا مقصد بشیر صرفی کی شخصیت اور فن کو گوشہ گمنامی سے نکال کر علمی وادبی حلقوں سے متعارف کروانا ہے۔

کورس ورک سے لے کر مقالے کی تکمیل تک میں اپنی انتہائی شفیق استاد اور صدر شعبہ اردو پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی و تعاون پر تہہ دل سے شکر گزار ہوں اور دعا گو بھی جنھوں نے نہ صرف میری علمی رہنمائی کی بلکہ وقتی طور پر مجھے ملازمت کی ذمہ داریوں سے آزاد کر کے اپنے تعلیمی سفر کو آگے بڑھانے کا موقع فراہم کیا۔

اپنے تعلیمی سفر کی اس منزل پر پہنچنے میں مجھے جن شخصیات کا تعاون حاصل رہا۔ ان کا ذکر کرنا اور شکریہ بجالانا بھی میرا فرض بنتا ہے۔ اس سلسلے میں اپنے محترم استاد اور نگران مقالہ ڈاکٹر عابد حسین سیال کے تعاون اور ہر قدم پر رہنمائی کی بہت شکر گزار ہوں کہ جن کی شخصیت میرے لیے اس تحقیقی کاوش کے دوران ڈھارس کی حیثیت رکھتی ہے اور جن کی رہنمائی کے بغیر اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ممکن نہیں تھا۔

میں اپنے دیگر اساتذہ کرام ڈاکٹر فوزیہ اسلم، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر ظفر احمد، ڈاکٹر نازیہ یونس کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتی ہوں موضوع کے انتخاب سے تکمیل تک علمی وادبی، تحقیقی و ... مکدیہ ... کی سطح پر مجھے مفید مشوروں سے نوازا اس کے علاوہ میں اپنی عزیزی سدرہ طاہر کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے کتابوں کی فراہمی میں بھرپور تعاون کیا۔

ان شخصیات کے علاوہ میں صاحب موضوع بشیر صرفی کے اہل خانہ کے تعاون کا بے حد شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں ان میں بشیر صرفی کے بیٹے سجاد حیدر کے تعاون کی بھی شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے میرے لیے متعلقہ معلومات اور تحقیقی مواد کی فراہمی کو یقینی بنایا۔

اس کے علاوہ بشیر صرفی کی بہنوں،ان کی اہلیہ اور خاص طور پر ان کے بھانجے اطہر وانی کی بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے انتہائی مصروفیت کے باوجود مجھے متعلقہ معلومات فراہم کیں اور جب مجھے ضرورت پڑی تعاون کیا۔ میں بشیر صرفی کے احباب جناب منور ہاشمی ،ڈاکٹر توصیف تبسم ،ڈاکٹر رشید امجد ، جناب نسیم سحر اور اشرف انصاری کے تعاون پر بھی ان کی شکر گزار ہوں۔

ان تمام مراحل سے بطریق احسن گزرنے میں انتہائی معاون ہستیاں میرے والدین اور میرے بچے ہیں جنہوں نے تعلیمی امور کی تکمیل میں مجھے ذہنی سکون اور کام کا موقع فراہم کیا۔ اگر ان کا تعاون شامل نہ ہوتا تو میرے لیے اس مرحلے تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ اس معاونت پر میں ان سب شخصیات کے تعاون پر سراپا سپاس ہوں۔

انجم مبین
اسکالر ایم فل اردو

باب اول

موضوع کا تعارف، تحقیقی طریقہ کار اور بنیادی مباحث

الف: موضوع کا تعارف اور تحقیقی طریقہ

i۔ موضوع کا تعارف:

میرے ایم فل کے مقالے کا مجوزہ موضوع ”بشیر صرفی کی شاعری میں مذہبی، رومانوی اور انقلابی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ“ ہے۔بشیر صرفی ستر اور اسی کی دہائی کے نامور لکھاری تھے۔ قیام پاکستان کے وقت ان کا خاندان کشمیر سے ہجرت کر کے راولپنڈی میں سکونت پذیر ہوا۔ ان کے دادا ملا محی الدین کاشمیری اور والد خواجہ عبد الاحد دلاور وانی فارسی اور عربی کے استاد شاعر تھے۔بشیر صرفی نے اگرچہ اردو اور انگریزی صحافت کو وسیلہ روزگار بنایا لیکن شعر وشاعری کو اپنی خاندانی میراث کے طور پر اپنائے رکھا۔ راولپنڈی میں لکھنے والوں کی انجمن اور حلقہ ارباب ذوق کے پلیٹ فارم سے ان کی تخلیقات منظر عام پر آتی رہیں۔ استاد غلام رسول طارق سے ان کی خاص نسبت تھی۔ اپنے معاصرین اعجاز راہی، رشید امجد، سرور کامران، نثار ناسک، شبنم مناوری اور منشایاد سے ان کا قریبی تعلق رہا۔ ان کی شاعری استادانہ رنگ لیے ہوئے ہے جس میں روایت کے زندہ عناصر سے استفادے کی بہترین صورتیں ملتی ہیں۔ کشمیر سے ہجرت نے ان کی شاعری میں رومان و انقلاب کی ایک دنیا آباد کردی ساتھ ہی مذہبی پس منظر نے انھیں تاعمر اپنے حصار میں رکھا۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے لیکن اپنی زندگی میں اپنے کلام کی ترتیب و اشاعت پر توجہ نہ دے سکے۔ ان کا کلام ان کی وفات کے بیس سال بعد 'کلام بشیر صرفی کے نام سے ڈاکٹر شفیق انجم نے مرتب کیا۔ یہ کتاب پورب اکادمی سے شائع ہوئی ہے۔ بشیر صرفی کے فکر و فن پر جامعاتی سطح پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ زیر نظر تحقیق اس کمی کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہو گی۔

ii۔ بیان مسئلہ:

بشیر صرفی کے شعری سرمائے میں حمدیہ و نعتیہ نظمیں، منقبت، سلام، موضوعاتی نظمیں، کشمیر کے حوالے سے نظمیں اور غزلیات شامل ہیں۔ ان اصناف میں سے ہر ایک کا مزاج مختلف ہے لیکن بشیر صرفی نے ان سے اپنی فکر کی ترویج کے لیے بخوبی کام لیا ہے۔ ان کی شاعری کا مجموعی مزاج دروں بینی کی طرف مائل ہے تاہم انھوں نے اپنے عہد اور کشمیر کے پس منظر میں لکھی گئی نظمیں انھیں ایک انقلابی شاعر کے روپ میں سامنے لاتی ہیں۔

اسی طرح حمدیہ اور نعتیہ قصائد میں ان کے مذہبی تصورات خاصے عملی نظر آتے ہیں۔ غزلوں میں رومان کے پہلو غالب ہیں گویا ان کی شاعری یک سطحی نہیں بلکہ متنوع جہات کی حامل ہے۔ زیر نظر تحقیقی مقالے میں ان جہات کو مذہبی، رومانوی اور انقلابی جہات کے عنوان کے تحت زیر بحث لا کر ان کی شاعری کے جملہ عناصر کا تجزیہ کرنا مقصود ہے۔ اس سے بشیر صرفی کی شاعری کی درست تفہیم کے ساتھ ساتھ متعلقہ پس منظری حقائق سے بھی آگاہی ملے گی۔

iii۔ مقاصدِ تحقیق:

اس تحقیق کے مقاصد درج ذیل ہیں:

۱۔ بشیر صرفی کو تفصیلی کوائف کے ساتھ متعارف کرانا۔

۲۔ بشیر صرفی کے مجموعی شعری افکار کو زیر بحث لانا۔

۳۔ بشیر صرفی کے شعری افکار کا مذہبی، رومانوی اور انقلابی تناظر میں تجزیہ کرنا

iv۔ تحقیقی سوالات:

مجوزہ تحقیقی موضوع "بشیر صرفی کی شاعری میں مذہبی، رومانوی اور انقلابی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ" کے لیے درج ذیل تحقیقی سوالات سامنے رکھے گئے ہیں۔

۱۔ بشیر صرفی کی شاعری کا مجموعی فکری تاثر کیا ہے؟

۲۔ بشیر صرفی کے شعری افکار میں مذہبی، رومانوی اور انقلابی عناصر کی کار فرمائی کی نوعیت اہمیت اور اثرات کیا ہیں؟

v۔ نظری دائرہ کار:

مجوزہ تحقیقی موضوع" بشیر صرفی کی شاعری میں مذہبی، رومانوی اور انقلابی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ" کے پیشِ نظر بشیر صرفی کی شاعری کا مطالعہ کر کے ان کے منفرد موضوعات مذہبی، رومانوی اور انقلابی عناصر کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھنا۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار:

زیرِ نظر مقالے میں بشیر صرفی کے مرتب کلام کے مجموعے پر انحصار کیا جائے گا۔ دستاویزی طریقہ تحقیق استعمال کرتے ہوئے حقائق کو اکٹھا کیا جائے گا۔ بنیادی ماخذات کے ساتھ ساتھ ثانوی ماخذات سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔ بشیر صرفی کے حالاتِ زندگی اور شخصیت سے آگاہی کے لیے ان کے اہل خانہ احباب اور دیگر رفقائے کار توصیف تبسم، منور ہاشمی اور رشید امجد وغیرہ سے انٹرویوز کو بھی شامل تحقیق کیا جائے گا۔

انٹرویوز، کانفرنسس، سیمینار، تحقیقی رسائل و جرائد کے ساتھ ساتھ شاعری کے حوالے سے تحقیقی و تنقیدی کتب کا مطالعہ بھی شاملِ تحقیق ہے جن میں سے چند کی فہرست ثانوی کتب میں دی گئی ہے۔ ان کتب کے مطالعے کا مقصد یہ ہے کہ شاعری کے متعین کردہ اصولوں کے تحت بشیر صرفی کی شاعری کے موضوعات کو پرکھا جا سکے۔ مزید کتب تک رسائی کے لیے سرکاری، جامعاتی اور نجی کتب خانوں سے استفادہ کیا جائے گا۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق:

مجوزہ موضوع "بشیر صرفی کی شاعری میں مذہبی، رومانوی اور انقلابی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ" پر ایم اے، ایم فل یا پی ایچ ڈی کی سطح پر کسی بھی قسم کا کوئی تحقیقی اور تنقیدی کام نہیں ہوا ماسوائے اس کے کہ ان کا کلام ان کی وفات کے بعد ڈاکٹر شفیق انجم نے مرتب کر کے پورب اکادمی، اسلام آباد سے شائع کیا۔ تاکہ ان کے کلام کو یکجا کیا جاسکے جو اس تحقیق کا بنیادی ماخذ ہے۔

viii۔ تحدید:

بشیر صرفی کے شعری سرمائے میں حمد، سینتیس (۳۷) نعتیں (ایک فارسی زبان میں اور دو ترجمہ شدہ نعتیں شامل ہیں) اور پانچ (۵) منقبت بھی شامل ہیں غزلیات میں ۹۳ کے قریب منتخب غزلیں اور تیرہ (۱۳) کے قریب غزلیں کلامِ معلق میں شامل ہیں۔ انیس (۱۹) غزلیں کلامِ متروک میں شامل ہیں۔ نظموں میں ی مد یی مہس (۳۳) کے قریب نظمیں ہیں جن میں سے گیارہ (۱۱) کشمیر کے موضوع پر ہیں۔ شاعری کے علاوہ ادبی سرمائے میں کئی غیر مدون نثری تحریریں بھی ہیں لیکن زیر نظر مقالے میں صرف ان کی شاعری کے حوالے سے بحث کی جائے گی۔ مجوزہ موضوع "بشیر صرفی کی شاعری میں مذہبی، رومانوی اور انقلابی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ" میں شعری اوزان و بحور پر بحث اور اسلوبی تجزیہ شامل نہیں ہو گا۔ صرف فکری عناصر کو مجوزہ تین جہتوں سے زیر بحث لایا جائے گا۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے مختلف تحقیقی ذرائع استعمال کیے جائیں گئے۔ تحقیقی و تنقیدی کتب کا مطالعہ بھی کیا جائے گا۔

ix۔ پس منظری مطالعہ:

پس منظری مطالعہ کے طور پر شاعری پر مبنی تحقیقی و تنقیدی کتب سے استفادہ کیا جائے گا۔ شاعری کے مباحث کا بغور مطالعہ کیا جائے گا۔ شاعری کی فکری جہتوں کے حوالے سے تحقیقی و تنقیدی کتب کا مطالعہ شامل ہو گا۔ نیز اس دور کے دیگر شعرا کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے گا۔

x۔ تحقیق کی اہمیت:

بشیر صرفی کا ادبی سفر تقریباً نصف صدی کو محیط ہے۔ اردو شاعری میں خصوصاً ساٹھ کی دہائی میں جدید رویوں اور موضوعات کے فروغ کے حوالے سے بشیر صرفی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کی شاعری جدید طرزِ فکر کی غماز ہے۔ ان کا کلام غیر مطبوعہ صورت میں تھا۔ جس کو ڈاکٹر شفیق انجم نے مرتب کر کے پورب اکادمی، اسلام آباد سے ۲۰۱۰ء میں شائع کیا۔ بشیر صرفی کے اس تمام کلام میں موضوعات اور اسلوب کی انفرادیت موجود ہے لہٰذا ان کے اپنائے گئے جدید رجحانات، رویوں اور موضوعات کے تجزیاتی مطالعے کی ضرورت ہے تاکہ ان کی شخصیت، حالاتِ زندگی اور سماجی کوائف کو سامنے لانے کے ساتھ ساتھ ان کی فکر کے متنوع گوشے بھی سامنے آسکیں۔

ب) بشیر صرفی: مختصر سوانح اور ادبی کوائف

i۔ سوانح و شخصیت

خاندانی پس منظر:

بشیر احمد وانی جو قلمی دنیا میں بشیر صرفی کے نام سے جانے جاتے ہیں کشمیری النسل تھے۔ ان کے آباؤاجداد کا تعلق بارہ مولہ کشمیر سے تھا۔ بشیر صرفی کے دادا ملا محی الدین، کشمیر کے راجا کے اتالیق تھے۔ وہ عربی، فارسی اور اردو کے قابل استاد تھے۔ وہاں کے راجا نے ان کی قابلت سے متاثر ہو کر ایک گاؤں انعام میں دیا تھا۔ چونکہ درویش صفت انسان تھے۔ اس لیے وہ گاؤں لینے سے انکار کر دیا۔ پھر ایران چلے گئے وہاں ایک ایرانی لڑکی سے شادی کی۔ بعد ازاں اسے کشمیر لے آئے۔

بشیر صرفی کے دادا بارہ مولہ کشمیر سے تعلق رکھتے تھے جبکہ دادی پونچھ سے تھیں اس وقت ان کا خاندان پتھروں کی تجارت کرتا تھا۔ محی الدین کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ان میں ایک بیٹے عبد الاحد دلاور وانی جو کہ بشیر صرفی کے والد تھے۔ محی الدین کے بیٹے جنگلات کے ٹھیکے لیتے تھے اور اس خاندان کا تعلق بعد ازاں کشمیر کی عملی سیاست سے بھی رہا۔ جن میں عبد الاحد دلاور وانی کا نام سرفہرست ہے۔ ڈوگرہ راج کے

دوران ۱۹۳۲ء میں جب کشمیر میں "مسلم کانفرنس" کے نام سے کشمیری مسلمانوں کی الگ جماعت بنی تو عبدالاحد اس میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ ۱۹۲۰ء میں ریشم خانے کی تحریک شروع ہوئی جس میں مزدوروں نے اپنے مطالبات کے لیے تحریک کا آغاز کیا تو آپ اس میں بھی پیش پیش رہے اور اپنی کاوشوں کی وجہ سے بارہ مولہ میں مسلم کانفرنس کے سکریٹری بھی رہے۔ انھی دنوں کشمیری لیڈر شیخ عبد اللہ نے ایک انگریز عورت سے خفیہ شادی کی تو اس کا نکاح عبدالاحد دلاور وانی نے ہی پڑھوایا۔ بعد ازاں شیخ عبد اللہ کی کانگریس سے بڑھتی ہوئی قربتوں کی بدولت عبد الاحد دلاور شیخ عبد اللہ سے الگ ہو گئے۔ پھر ان کی وابستگی قائد اعظم کے ساتھ رہی۔ ان کو مسلمانوں اور پاکستان کے ساتھ گٹھ جوڑ کی وجہ سے دلاور کا لقب ملا۔ قیام پاکستان کے بعد عبدالقیوم نے جب ڈوگرں کے خلاف آواز اٹھائی اور کچھ ہفتے بعد کشمیر کو بھارتی تسلط سے آزاد کرانے کے لیے قبائلیوں نے حملہ کیا تو عبد الاحد دلاور وانی نے ان کی میزبانی کے فرائض سر انجام دیے۔ جب انڈین آرمی کا زور بڑھا تو قبائلیوں کے پاس واپس جانے کے سوا کوئی چارہ نہ بچا تو عبد الاحد بھی خفیہ طور پر پاکستان پہنچے اور آزاد کشمیر کے علاقے میں عبد القیوم کی آزادی کی کاوشوں میں شامل ہو گئے اور ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کشمیر کے ایک حصے کو آزاد کرا لیا گیا۔ عبد الاحد نے کشمیریوں کو حوصلہ دینے کے لیے کشمیر ریڈیو سٹیشن قائم کرنے کے لیے بھی اہم خدمات سر انجام دیں اور دو تین زبانوں میں ڈوگری، اردو، کشمیری اور پنجابی میں نشریات کا آغاز کیا۔ اس ریڈیو نے کشمیر تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔ ابتدا میں یہ ریڈیو سٹیشن ایک ٹرک میں قائم کیا گیا۔ عبد الاحد کے خاندان کو ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں تو اس ریڈیو کے ذریعے ان کو پتا چلا کہ وہ زندہ ہیں اور پاکستان ہی میں ہیں۔

بعد ازاں دونوں ملکوں میں جنگ بندی کا معاہدہ ہوا اور ڈاک کا نظام بحال ہوا تو یہ ریڈیو سٹیشن پشاور روڈ پر آزاد کشمیر ریڈیو کے نام سے قائم ہوا اب وہ پنڈی تھری کے نام سے مشہور ہے۔ عبد الاحد دلاور وانی ایک مجاہد کی زندگی جیے۔ اگر وہ چاہتے تو حکومت سے بہت جاگیر حاصل کر سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ جب ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج نے ان کے خاندان کے لیے گھیرا تنگ کیا تو ان

کا خاندان راولپنڈی پاکستان آ گیا تو ایمر جنسی میں انھوں نے صدر چھوٹا بازار کے احاطے میں ایک ٹوٹا ہوا گھر لے کر رہائش اختیار کی اور ان حالات میں انھوں نے پاکستان میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا اور تڑار کھل ریڈیو آزاد کشمیر جیسے پنڈی تھری بھی کہتے تھے۔ ادبی، دینی اور سیاست کے حوالے سے پروگرام کرتے رہے۔ بشیر صرفی کو بھی اکثر ریڈیو سٹیشن لے جاتے پھر گھر میں بھی ان کی تربیت پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ عبدالاحد کی وفات ۱۹۹۱ء میں راولپنڈی میں ہوئی۔

پیدائش اور بچپن:

اصل نام بشیر احمد وانی اور قلمی نام بشیر صرفی ہے۔

> ڈاکٹر شفیق انجم کے مطابق بشیر صرفی ۵ اگست ۱۹۴۲ء کو محلہ جلال صاحب بارہ مولہ کشمیر میں پیدا ہوئے۔[۱]

تاریخ پیدائش کے حوالے سے اس بات کی تصدیق ان کی بہن فہمیدہ بانو نے راقمہ کے ساتھ ۲۲ مارچ ۱۹۲۰ء کو اپنے انٹرویو میں بھی کی۔ علاوہ ازیں بشیر صرفی کی میٹرک کی سند سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ بشیر صرفی کے والد عبدالاحد دلاور وانی کا تعلق چونکہ کشمیر کی عملی سیاست سے بھی تھا۔ وہ جدوجہدِ آزادی کشمیر کے سرگرم رکن تھے۔ قیام پاکستان کے بعد چونکہ کانگریس کو مطلوب تھے۔ اس لیے مجبور ہو کر ہجرت کر کے راولپنڈی صدر بازار ہاتھی چوک میں آکر مقیم ہوگئے ان کو یہ گھر حکومت پاکستان کی طرف سے الاٹ ہوا۔

عبدالاحد دلاور کی شادی زینب بیگم سے ان کے خاندان سے جان پہچان کی بنا پر ہوئی۔ زینب بیگم کا تعلق بھی بارہ مولہ کشمیر سے تھا۔ زینب بیگم سے عبدالاحد کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے پیدا ہوئے۔ سب سے بڑے بیٹے بشیر احمد وانی تھے جو صرفی تخلص کرتے تھے۔ اس کے بعد بیٹی حفیظ وانی جنھوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ حفیظ کے بعد ایک بیٹا غلام نبی جو نو ماہ کی عمر میں فوت ہو گئے۔ اس کے بعد فہمیدہ بانو اور سب سے چھوٹی بیٹی طاہرہ جبین ہیں۔

حفیظ وانی کی شادی خواجہ عبدالصمد وانی سے ہوئی۔ یہ بھی ہجرت کے بعد پاکستان آئے۔یہ بھی جدوجہد آزادی کشمیر کے سرگرم رکن تھے۔ انھوں نے" ہفت روزہ کشمیر" کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالا۔ یہ الحاقِ پاکستان کے نظریے سے وابستہ تھےاور سکندر حیات کے دور میں آزادی کشمیر کی سیاست کے سلسلے میں بِسسر ایڈوائزر بھی رہے۔ حفطیہ وانی کے فرزند اطہر وانی آج بھی صحافت سے وابستہ ہیں اور جدوجہد آزادی کشمیر کے لیے قلمی محاذ پر جنگ لڑ رہے ہیں۔اس کے بعد بشیر صرفی کی بہن فہمیدہ بانو ہیں۔ انھوں نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ان کے شوہر سعودی عرب میں مقیم تھے۔ فہمیدہ بانو نو سال تک سعودی عرب میں مقیم رہیں۔ان کے تین بچے ہیں۔ فہمیدہ بانو کا کچھ رجحان شاعری کی طرف بھی ہے کشمیر کے حوالے سے انھوں نے نظمیں لکھی ہیں۔

عبدالاحد کی سب سے چھوٹی بیٹی طاہرہ جبیں ہیں وہ زیادہ تر شوہر کے ساتھ لبیا میں رہیں۔ان کے پانچ بچے ہیں اُن کے شوہر فاروق عزیز ریاست پٹیالہ سے تھے۔ آج کل طاہرہ جبیں پی ڈبلیو ڈی راولپنڈی میں مقیم ہیں۔بشیر صرفی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد نرینہ تھے اور بہنوں سے بڑے بھی تھے۔

وہ اپنی والدہ اور بہن حفیظ بانو کے ساتھ کشمیر میں مقیم تھے کہ والد کے کشمیر کی سیاست میں عمل دخل کی وجہ سے کانگریسی بشیر صرفی کو بھی نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ اس بات کا پتاان کی والدہ زینب بیگم کو چلا تو بچوں کو لے کر راولپنڈی اپنے شوہر کے پاس آ گئیں۔اس وقت بشیر صرفی کی عمر ۸ یا ۹ سال تھی بشیر صرفی کے والد اس وقت ریڈیو آزاد کشمیر سے منسلک ہوئے آپ تقاریر بھی لکھتے تھے۔ پروگرام بھی براڈکاسٹ کرتے تھے۔ مثنوی مولانا روم کا منظوم ترجمہ کشمیری زبان میں کیا۔ تو اس پر خانہ فرہنگ کی طرف سے آپ کو آقائے دلاور کا نام دیا گیا جو آزاد کشمیر ریڈیو سے ہی نشر ہوتا تھا۔ یہ ۷۴۔۱۹۷۲ء کی بات ہے۔بشیر صرفی جب راولپنڈی ہجرت کر کے آئے تو ان کے والد کو حکومت کی طرف سے ایک ٹوٹا پھوٹا گھر صدر میں ملا تھا۔

فہمیدہ بانو بتاتی ہیں کہ:

ایک کمرہ اور چار دیواری تھی۔ باقی گھر ملبے کا ڈھیر تھا۔ ہر طرف گھاس تھی۔ اس میں سے بچھو بھی ر ب کلہ یے تھے اور ہمیں کاٹتے تھے۔ ان حالات میں بشیر صرفی کا بچپن گزرا۔[2]

اطہر وانی اس ضمن میں بیان کرتے ہیں:

بشیر صرفی کا انداز بعض اوقات تلخ ہوجایا کرتا تھا۔ حقیقت میں یہ انسان کے اندر حالات کی تلخیاں ہوتی ہیں جو بچپن میں سمجھ نہیں آتیں۔[3]

بشیر صرفی کا بچپن سے ہی قلم اور کتاب سے گہرا تعلق تھا کیونکہ ان کے والد علمی و ادبی شخصیت تھے اور ان کی تربیت اور ماحول میں علم و ادب کا اثر نمایاں تھا یہی وجہ ہے کہ بشیر کی شخصیت بھی انھی خطوط پر استوار ہوئی۔

ان کی بہن فہمیدہ بانو اپنی یاداشت میں کہتی ہیں:

میں کلاس ون میں تھی کہ بھائی کا قلم سکول لے گئی وہ میرے پیچھے سکول تک پہنچ گئے۔ اور ہلکا سا تھپڑ لگا کر بولے میرا پین دو میں اپنا پن کسی کو نہیں دیتا۔ بشیر صرفی بہت سعادت مند تھے اس کے ساتھ ساتھ بہت جذباتی تھے۔ لیکن دل کے بہت صاف تھے فوراَ غصہ ٹھنڈا بھی ہوجاتا تھا۔ بھائی کی حیثیت سے بہنوں سے بہت پیار کرتے والے تھے۔ مزید یہ کہ چھوٹی بہن کی شادی پر والد صاحب کا انتقال ہوچکا تھا۔ جب میں سعودی عرب سے پاکستان آئی تو سامنے بشیر کھڑے تھے میں اندر ہی اندر رو رہی تھی انھوں نے کہا کہ طاہرہ کی شادی پر میں اکیلا تھا۔ فہمیدہ تم آگئی ہو تو مجھے ڈھارس مل گئی۔[4]

بشیر صرفی اکلوتے بھائی اور اکلوتی اولاد نرینہ ہونے کے ناطے لاڈو ناز میں آپ کا بچپن و جوانی گزرا۔ صدر میں تقریباَ ۱۸سال تک رہنے کے بعد سیٹیلائیٹ ٹاون شفٹ ہو گئے۔ بشیر صرفی اپنے خاندان سے بہت محبت کرتے تھے۔

ان کی بہن حفیظ وانی اپنے بھائی کے بارے میں کہتی ہیں:

اتنے شفیق بھائی تھے کہ بتا نہیں سکتی خاص طور پر میرے ساتھ بہت انسیت تھی
شادی سے وفات تک ہر عید پر ہم بہنوں کو بچوں سمیت اپنے گھر بلایا کرتے تھے۔
رشتوں کے معاملے میں بہت روائتی قسم کے انسان تھے۔[۵]

تعلیم اور ملازمت:

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ بشیر صرفی کے دادا ملا محی الدین کشمیری مہاراجہ پونچھ کے دربار میں اتالیق تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کے قابل استاد بھی تھے اور فارسی و کشمیری میں شعر و شاعری بھی کرتے تھے مہاراجہ نے آپ کی قابلیت سے متاثر ہو کر ایک گاؤں آپ کو تحفے میں دیا تھا۔ چونکہ طبیعت میں درویشی اور عاجزی تھی اس لیے وہ تحفہ قبول نہیں کیا۔بشیر صرفی کے والد عبدالاحد دلاور وانی بھی عربی، فارسی اور کشمیری کے عالم اور فارسی و کشمیری زبان کے استاد شاعر تھے۔ قیام پاکستان کے وقت خواجہ عبدالاحد ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور صدر بازار ہاتھی چوک میں سکونت اختیار کی۔اپنے والدین کی اکلوتی اولاد نرینہ ہونے کے باعث آپ کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی گئی۔ میٹرک تک تعلیم راولپنڈی کے ڈیسر ہائی سکول سے حاصل کی۔اس وقت چونکہ عربی فارسی کی تعلیم کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ میٹرک کے دوران ہی ان کے والد نے عربی فارسی کی کتب خود پڑھا دیں۔اس سلسلے میں بشیر صرفی ایک جگہ خود لکھتے ہیں:

> ہم تیسری چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے اور بابا جان جب فرید الدین عطار کا پند نامہ ہمیں رات دیر تک پڑھاتے تھے تو ہماری جان ضیق میں آتی۔ ہمارے مڈل پاس کرنے تک ہمیں مٹی کے تیل والے لیمپ کی روشنی میں گلستان، بوستان، کریما، نام حق، فرید الدین عطار کا پند نامہ پڑھا دیں۔ سکول سے واپس آ کر ہم سرکاری نل سے پانی بھر بھر لاتے اس سے جو وقت بچتا بابا جان آموختہ کی نذر کر دیتے بابا جان خود بھی فارسی میں نعت کہتے تھے اور کبھی کبھار اپنی کوئی نعت ہمیں بھی یاد کرا دیتے۔ان کڑی بندشوں میں ہم نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔[۶]

میٹرک کرنے کے بعد بشیر صرفی کو مزید تعلیم کے لیے کراچی بھجوا دیا گیا۔ کراچی اس وقت پاکستان کا دارالخلافہ تھا اور بڑا شہر بھی تھا وہاں پر اچھی تعلیم اور روزگار کے مواقع نسبتاً زیادہ تھے چنانچہ انہوں نے ایف

اے اور گریجویشن کا امتحان پاس کیا۔ اور پھر کراچی یونیورسٹی سے ایم اے صحافت کیا۔ اس دوران آپ کا قیام پیر الٰہی بخش کالونی کی ایک مسجد کے حجرے میں رہا۔ یہی زمانہ ہے کہ جب ان کو ادب سے رغبت پیدا ہوئی اور شعر و شاعری کی طرف رجحان بڑھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> اس دور میں ہمیں آوارہ خوابی کی عادت پڑی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے "توبتہ النصوح" سے رسوا کے "امراؤ جان ادا" اور شرر کے گزشتہ لکھنو اور سرشار کے "فسانہ آزاد" سے لے کر "تلاشِ بہاراں" اور "آگ کا دریا" وغیرہ پھر فیض، ناصر کاظمی، مجید امجد اور اساتذہ میں میر، غالب، داغ، آتش کا مطالعہ ہم مسجد کے حجرے میں گناہ کی طرح چھپ چھپ کر کرتے تھے۔ نقوش کے افسانہ نمبر کو تو ہم ۱۹۶۰ء ہی سے مطالعہ کے علاوہ تکیے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ شاعری کی ابتدا ہم اس سے پہلے کر چکے تھے۔[۷]

یوں بشیر صرفی کی تعلیم مکمل ہوئی چونکہ ان کے والد عبدالاحد آزاد کشمیر ریڈیو کی بنیاد رکھنے والوں میں سے تھے اس لیے ریڈیو سے وابستگی اور آزادی کشمیر کے موقف کو اجاگر کرنے کے لیے ایم اے صحافت کرنے کے بعد آزاد کشمیر ریڈیو میں بحیثیت پروڈیوسر ملازمت اختیار کی اور اپنی محنت اور مقصد سے لگن کے باعث سینئر پروڈیوسر کے عہدے تک پہنچے اور اسی ملازمت نے جہاں آگے ادبی ذوق کو جلا بخشی وہاں تحریک آزادی کشمیر کے صوتی محاذ پر بھی گراں قدر خدمات سرانجام دینے کا موقع میسر آیا۔

اطہر وانی بیان کرتے ہیں:

> دوران ملازمت بشیر صرفی نے اپنی خاندانی روایات کے مطابق شعبہ صحافت اور آزاد کشمیر ریڈیو سے کشمیری ادب و ثقافت کی ترویج کے لیے بھی بہت کام کیا۔[۸]

ازدواجی زندگی اور اولاد:

کہا جاتا ہے کہ مرد کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔ خواہ وہ کسی بھی ماں، بہن، بیوی یا بیٹی کے روپ میں ہو۔ انسان کی شخصیت کی تعمیر میں ماں کا کردار اور زندگی کی کامیابی میں شریک حیات

کے کردار کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ بشیر صرفی کو قدرت کی طرف سے بہت تھوڑی عمر اور بہت زیادہ صلاحتیں ودیعت ہوئی۔ انھوں نے ۴۹ سال عمر پائی اس دوران وہ بہت سے کام کر گئے۔

بشیر صرفی ۱۲ دسمبر ۱۹۶۹ء میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ ان کی شریک حیات نگہت بشیر کا تعلق امر تسر سے تھا۔ ان کا خاندان راولپنڈی میں ہی مقیم تھا۔ اور انھوں نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی اور رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئیں۔ نگہت بشیر کے والد صرافہ بازار راولپنڈی میں جیولری کا کام کرتے تھے۔ شادی سے قبل بشیر صرفی نے نگہت کو دیکھا تک نہیں تھا اس سلسلے میں نگہت بتاتی ہیں کہ میں نے بشیر کا خط دیکھا جس میں انہوں نے اپنے دوست کو لکھا تھا: حیرت سے ڈوب مرو میں نے تمہاری بھابھی کو ابھی تک نہیں دیکھا۔[9]

بشیر صرفی کی نگہت کے ساتھ رفاقت ۲۰ سال رہی۔ اور ۱۹۹۱ء میں بشیر صرفی ایک ایکسیڈنٹ میں نگہت بشیر کو داغِ مفارقت دے گئے۔

نگہت بشیر صرفی بتاتی ہیں:

> بحیثیت مجموعی ان کی ازدواجی زندگی خوشگوار گزری صرف ان کی سگریٹ پینے کی عادت پر میں بہت نالاں رہتی تھی۔ ہمارے بیچ کوئی زیادہ کھٹ پٹ نہیں ہوتی تھی۔ اگر کبھی ناراض بھی ہوتے تو کبھی وہ منا لیتے اور کبھی میں۔ بشیر بہت خوش مزاج انسان تھے گھر میں خوشگوار موڈ میں رہا کرتے تھے۔ بچوں کے ساتھ ان کا رویہ بڑا اعتدال والا تھا۔ وہ بچوں کے دوست بھی تھے لیکن ان پر ان کا رعب بھی بہت تھا۔ بچوں کی تعلیم میں خصوصیت سے دلچسپی لیتے تھے۔ معاشرتی لحاظ سے بہت سوشل تھے۔ گفتگو کا فن جانتے تھے۔ محفلوں میں بہت خوش رہا کرتے تھے۔ شوگر کے مریض تھے اس کے باوجود کھانے پینے کے بہت شوقین تھے۔ انہیں دعوتیں کھانے اور دعوتیں کرنے کا بہت شوق تھا۔ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ ساتھ میرے عزیزوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے میرے دل میں ان کی اور بھی عزت بڑھ جاتی تھی۔ خالصتاً پاکستانی مرد تھے گھر کے کاموں میں معاونت

> نہیں کرتے تھے لیکن اپنی ذمہ داریوں سے کبھی غفلت نہیں برتتے تھے۔ میرے ہاتھوں کی خوبصورتی کی اکثر تعریف کیا کرتے تھے۔ ان کی وفات پر گویا مجھ پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا بچے چھوٹے تھے لیکن ان کی رفاقت نے مجھے جو اعتماد اور حوصلہ دیا اس کی وجہ سے میں نے زندگی کی مشکلات کا سامنا کیا اور آج میرے سب بچے ماشااللہ کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں۔"[۱۰]

بشیر صرفی ایک ادبی شخصیت تھے قلم سے ان کا رشتہ موروثی بھی تھا۔ صحافت سے تعلق وراثت سے بھی ملا۔ شعر و شاعری بھی ان کے خون میں رچی بسی تھی۔

نکہت بشیر ادب کے حوالے سے بتاتی ہیں:

> بشیر صرفی کو ادب سے اس قدر دلچسپی تھی کوئی بھی کتاب پڑھنی شروع کرتے تو رات کو ہی اس کو ختم کر کے سوتے اور جب بھی اشعار کی آمد ہوتی تو مجھے سوتے میں بھی جگا کر اپنا کلام سناتے اور اگر میں نیند کی وجہ سے داد نہ دوں تو ناراض ہوا کرتے تھے۔"[۱۱]

اولاد:

اولاد قدرت کا ایک حسین تحفہ ہے اور حضرت انسان کی بقا کی ضامن بھی اولاد کے بغیر انسانی زندگی کا تصور ادھورا سا لگتا ہے۔ بشیر صرفی اور نکہت بشیر کو اللہ نے اولاد کی نعمت سے نوازا۔ ان کے چار بچے، دو بیٹے دو بیٹیاں ہیں۔ بڑے بیٹے سجاد حیدر ہیں یہ سجاد حیدر ہی ہیں جن کی کاوشوں سے بشیر صرفی کو گوشہ گمنامی سے نکال کر ادبی حلقوں میں متعارف کروایا۔ سجاد حیدر ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۲ء میں راولپنڈی میں پیدا ہوئے اور آج کل نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز میں آئی ٹی کے شعبے میں فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔ جب بشیر صرفی کا انتقال ہوا تو سجاد اس وقت برن ہال کالج میں ایف۔ اے کے طالب علم تھے۔ والد کی وفات کے بعد سجاد حیدر پر بڑے بیٹے ہونے کی حیثیت سے بھاری ذمہ داریاں آن پڑیں۔ سجاد حیدر نے H-8 کالج سے گریجویشن کیا اور ساتھ شام میں کمپیوٹر کا ڈپلومہ لیا۔ ریڈیو پاکستان میں اناؤنسر کا کام کیا۔ سجاد نے ایپاکس سے کمپیوٹر کا ڈپلومہ

لینے کے بعد NIE اسلام آباد میں کچھ عرصہ کام بھی کیا۔ سجاد حیدر آج کل اپنی اہلیہ، بچوں اور والدہ کے ساتھ G-13 میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کی اہلیہ مائین فاطمہ سیکیورٹی اینڈ ایکسچینج کمیشن میں ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہیں اور ان کے دو بچے محمد سائم اور عمر سجاد ہیں۔ سجاد کے بعد ان کی بیٹی منزہ ہیں جو ۱۹۷۳ء میں پیدا ہوئیں انھوں نے گریجویشن گورنمنٹ کالج فارویمن سیٹیلائٹ ٹاون سے کیا۔ انھیں ادب سے دلچسپی ہے انھی کے اصرار پر سجاد حیدر نے والد کی کتاب چھپوائی۔ آجکل وہ امریکہ میں مقیم ہیں۔ ان کے بعد جواد حیدر ہیں۔ جواد حیدر ۱۹۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ وہ انکم ٹیکس میں وکیل ہیں۔ انھوں نے ایم بی اے کیا ہوا ہے۔ آج کل گلزارِ قائد میں مقیم ہیں۔ ان کے دو بچے ہیں۔ اس کے بعد آمنہ بشیر ہیں جو والد کی وفات پر چھ سات سال کی تھیں۔ آج کل اپنے شوہر کے ساتھ جدہ میں مقیم ہیں۔ ان کو شعر وشاعری کا بھی شوق ہے۔ کشمیر اخبار میں ان کی نظمیں بھی چھپی ہیں۔ بشیر صرفی پر اللہ کا اس لحاظ سے بھی خاص کرم تھا کہ ان کی اولاد بہت لائق اور سعادت مند ہے۔

شخصیت اور مشاغل:

بشیر صرفی کی شخصیت میں ٹھہراؤ نظر آتا ہے۔ وہ باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ گفتگو کے ہنر سے بخوبی واقف تھے۔ بحیثیت مجموعی ایک خوش اخلاق، خودگفتار، خوددار اور ذمہ دار انسان تھے۔ حفظِ مراتب کا خیال رکھتے تھے۔ کسی بھی انسان کی عادات، اس کا لوگوں کے ساتھ برتاؤ اور اس کی شخصیت کا اندازہ لگانا ہو تو اس کے بارے میں دوسرے لوگوں کے اثرات اس سلسلے میں معاون ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں گھر کے افراد کی رائے مستند ہوتی ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں کے تاثرات جن کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے۔

اطہر وانی جو بشیر صرفی کے بھانجے ہیں بیان کرتے ہیں:

> بشیر صرفی ایک باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ ان سے مختصر سی گفتگو کرنے سے ان کے ادبی ذوق اور ہمہ گیر معلومات کا گہرا احساس ہوتا تھا۔ آپ کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا اور پاکستان کی ادبی دنیا کے بہت سے شعرا اور ادیب آپ کے ذاتی دوستوں

میں شامل تھے۔ راولپنڈی صدر کا دو گیز کیفے کسی زمانے میں راولپنڈی کے شعرا کا
خاص ٹھکانہ ہوا کرتا تھا۔ جس طرح لاھور میں کافی ہاوس کو ادبی حلقوں میں خاصی
اہمیت رہی اسی طرح راولپنڈی کے شعرا اور ادیب دو گیز کیفے میں محفلیں جماتے
تھے۔ ان محفلوں میں بشیر صرفی باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔ [۱۲]

اشرف انصاری بشیر صرفی کے دوستوں میں سے ہیں وہ ریڈیو اسٹیشن پنڈی ٹو میں شعبہ خبر سے وابستہ
تھے بشیر صرفی کے بارے میں بتاتے ہیں:

بشیر صرفی کی شخصیت اعلی انسانی اوصاف سے عبارت تھی میں جس بشیر صرفی کو جانتا
تھا وہ کم گو، کم آمیز اور انسانوں سے محبت کرنے والا شخص تھا۔ [۱۳]

ڈاکٹر منور ہاشمی کا شمار بھی بشیر صرفی کے دوستوں میں ہوتا ہے۔ منور ہاشمی کا تعلق بھی ریڈیو پاکستان
سے تھا۔ وہ بشیر صرفی کی شخصیت کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

بشیر صرفی انتہائی مخلص انسان تھے وہ اپنے کام، ملازمت، اپنے احباب اور اپنے گھر اور
رشتوں سے بہت اخلاص رکھتے تھے۔ رفیق کار کی حیثیت سے تقریباً پانچ سال اکٹھے
رہے۔ وہ ہمیشہ خوش اخلاقی سے ملتے دوستوں کے دکھ سکھ میں شریک ہونا ان کا
شیوہ تھا۔ اکثر ان کی موجودگی سے محفل قہقہ زار بن جاتی وہ کسی کی عیب جوئی نہیں
کرتے منہ پر بات کرتے تھے۔ انھوں نے زندگی بھر محنت کی اور اپنے بچوں کی
پرداخت میں سرگرم رہے۔ بشیر صرفی جیسے لوگوں کا اس دنیا سے چلے جانا باعث
افسوس ہے۔ احباب کے حلقوں سے لے کر ادبی و ملکی سطح پر ان کا خلا پر کرنا مشکل
ہے۔ ان کی زندگی اور کام کو جتنا خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔ [۱۴]

وفات:

بشیر صرفی ۶ دسمبر ۱۹۹۱ء کو ایک حادثے میں فوت ہو گئے۔

ان کی اہلیہ بیان کرتی ہیں:

> وفات سے قبل بشیر کے کئی دفعہ ایکسیڈینٹ ہوئے جس کی وجہ سے انھوں نے موٹر بائیک چلانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ پیدل ۶ روڈ سے سڑک کراس کر رہے تھے۔ صبح ساڑھے دس بجے کا وقت تھا کہ ایک سوزوکی نے ٹکر مار دی۔ انھیں سینٹر ہسپتال پہنچایا گیا۔ بے ہوشی کی حالت میں ۱۵ دن تک ہسپتال میں رہے۔ پھر انھیں ملٹری ہسپتال راولپنڈی میں شفٹ کیا گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد تقریباً پونے دو مہینے زندہ رہے۔ ہسپتال میں بھی شاعری نہیں چھوڑی کہا کرتے تھے مجھے قلم لا دو میں کچھ لکھوں۔[۱۵]

ان کی وفات پر "افتخار ایشاء" میں جو خبر شائع ہوئی:

> "”ایڈیٹر افتخار ایشاء“ بشیر احمد وانی گزشتہ دنوں انتقال کر گئے۔ دو ماہ قبل وہ ٹریفک کے ایک حادثے میں شدید زخمی ہو گئے تھے۔ اس حادثے میں ان کے سر اور ٹانگوں پر شدید زخم آئے۔ انھیں زخمی حالت میں جنرل ہسپتال راولپنڈی میں داخل کرایا گیا۔ بعض ازاں ان کی نازک حالت کے پیشِ نظر ملٹری ہسپتال راولپنڈی میں شفٹ کیا گیا۔ لیکن ان کی حالت دن بدن بگڑتی گئی وہ ایک عرصے سے شوگر کے مرض میں بھی مبتلا تھے۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ ایک عرصے سے جگر کی خرابی کے مرض میں بھی مبتلا تھے اور ان کی موت کا باعث بھی یہی بیماری بنی۔ ان کی اس ناگہانی موت پر ہر آنکھ اشک بار ہے۔[۱۶]

ان کی اہلیہ کے مطابق بشیر صرفی کو ہیپاٹائٹس سی تھا جس وجہ سے ان کا جگر ختم ہو گیا تھا۔ بشیر صرفی راولپنڈی کے شاہ قاف قبرستان نیو کٹاریاں میں مدفون ہوئے۔

ii۔ ادبی کوائف:

بشیر صرفی کی زندگی کے مطالعے اور ان کی شخصیت کے تجزیے سے یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ فطری طور پر تخلیقی جوہر ان کی طبیعت کا حصہ تھا جو انھیں قدرت کی طرف سے بھی ملا اور انھوں نے اپنے دادا اور والد سے وراثت میں بھی پایا۔ ان کے والد کا تعلق صحافت اور شعر و شاعری سے بھی تھا لہٰذا بشیر صرفی کا

قدرتی میلان بھی صحافت کی طرف تھا اور شعر و شاعری سے متعلق تخلیقی جوہر اندر ہی اندر پختہ تر ہوتا گیا۔ بشیر صرفی نے سن ساٹھ کے قرب وجوار میں شعر کہنے کا آغاز کیا اور یہ عمل تاوفات جاری رہا۔

بشیر صرفی کے ادبی ذوق کے حوالے سے اطہر وانی جو ان کے بھانجے بھی اور متحرک کالم نویس بھی ہیں بیان کرتے ہیں:

> بشیر صرفی ابتدائی عمر سے ہی ادبی ذوق رکھتے تھے۔ اس ذوق کو پروان چڑھانے میں ان کے گھر اور خاندانی ماحول کا نمایاں اثر تھا۔ بشیر صرفی کے والد عبد الاحد دلاور وانی فارسی اور کشمیری زبان کے عالم اور قادرالکام شاعر تھے۔ ان کی شخصیت کا گہرا اثر بشیر صرفی کی شخصیت پر تھا جس کی وجہ سے قدیم اور جدید اور انگریزی ادب کا مطالعہ کیا۔ جس کا نمایاں اثر ان کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے۔[۱۷]

ڈاکٹر شفیق انجم بشیر صرفی کی ادبی تربیت کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

> بشیر صرفی کی ادبی تربیت کا آغاز ایم اے کے دوران جب وہ پیر الہی بخش کالونی کی مسجد کے احاطے میں مقیم تھے تو یہ سلسلہ وہاں سے شروع ہوا۔ پھر راولپنڈی صدر آکر دو گیز کیفے میں مختلف دوستوں کے ساتھ مل کر ادبی گفتگو کا موقع ملتا تھا۔ بشیر صرفی دو گیز کیفے کی محفلوں میں باقاعدگی سے جاتے تھے۔ سن ساٹھ کی دہائی میں راولپنڈی میں نوجوان ادیبوں کی اس صف میں بھی شامل رہے جن کی تربیت استاد غلام رسول طارق کے ہاتھوں ہوئی۔ حلقہ ارباب کے جلسوں میں بھی برابر شرکت کرتے رہے۔ جب لکھنے والوں کی انجمن کی بنیاد پڑی تو اس کے ہفتہ وار جلسوں کے انعقاد پر بھی پیش پیش رہے۔[۱۸]

ڈاکٹر رشید امجد کی آپ بیتی ''تمنا بے تاب'' میں انجمن کے جو ادیبوں کے نام گنوائے ہیں ان میں بشیر صرفی بھی شامل ہیں۔

> انجمن کے اجلاسوں میں میرے سرور کامران، بشیر صرفی، نثار ناسک، سلیم ظفر، منشا یاد کے ساتھ زرا سینئر نسل کے ادبا میں سے احمد شمیم، آفتاب اقبال شمیم بھی باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔ بشیر صرفی لکھنے والوں کی انجمن کے سیکرٹری بھی

رہے اس انجمن کے سیکرٹریوں میں سے میرے علاوہ اعجاز راہی، سرور کامران، بشیر صرفی، نثار ناسک اور منشا یاد شامل ہیں۔ استاد غلام رسول طارق سے تعلق اور ان کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے کے حوالے سے بشیر صرفی نے اپنی نثری تحریر "یادیں " میں لکھا ہے کہ یہ غالباً ۵۹۔۱۹۵۸ء کی بات ہے کہ جب وہ پہلی بار خیام پینٹر کی دکان پر استاد صاحب سے ملے تھے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ جاری رہا۔۶۷۔۱۹۶۶ء بشیر صرفی کراچی میں رہے لیکن استاد صاحب سے خط و کتابت جاری رہی۔ راولپنڈی واپس آنے پر ملاقاتوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔[۱۹]

لکھنے والوں کی انجمن استاد غلام رسول طارق کی محفلیں حلقہ ارباب ذوق اس کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کی نجی ادبی مجالس میں بشیر صرفی اپنی تمام تر ملازمتی مصروفیات کے باوجود شرکت کرتے تھے اور اس دور کی ادبی سرگرمیوں میں اپنے کردار کو یقینی بناتے خصوصیت کے ساتھ ان کا تعلق رشید امجد اور وقار عزیز سے تھا۔ رسول طاؤس نے اپنی ایک نظم میں اس گروپ کو مثلث کہا ہے بقول ان کے مثلث کے یہ مسافر جو تازہ دم تھے نئی نئی منزلوں کی دھن پر گویا سن ساٹھ کی دہائی کے چلتے پھرتے پیامبر تھے۔ بشیر صرفی سن ساٹھ کی دہائیوں میں ایک ممتاز شاعر ادیب اور صحافی کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔ اپنے عہد کی ادبی تحریکوں میں انھوں نے فعال کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ راولپنڈی کی ادبی تاریخ میں ان کی خدمات سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔

مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام:

بشیر صرفی ایک شاعر ادیب اور صحافی کی حیثیت سے ابھرے۔ اپنے بل بوتے پر ریڈیو پاکستان میں سینئر پروڈیوسر کے عہدے تک پہنچے۔ اس کے ساتھ مختلف اخبارات میں مضامین اور کالم بھی لکھتے رہے۔ اسی صحافتی شوق کی وجہ سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر باقاعدہ طور پر مختلف اخبارات، روزنامہ جنگ، روزنامہ حیدر، حرمت، پھر لندن سے شائع ہونے والے ہفت روزہ جریدے اخبارِ وطن کی ادارت کے فرائض انجام

دیتے رہے۔ بعد ازاں افتخار ایشیا کے مدیر بھی مقرر ہوئے۔ اُس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنا ایک انگریزی اخبار "ویو ویک" بھی جاری کیا اور وفات تک صحافت سے وابستہ رہے۔

ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

> بشیر صرفی پاکستان میں اردو / انگریزی صحافت اور ابلاغیات کی ایک قد آور شخصیت تھے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے آپ کو اردو زبان و ادب کے لیے وقف کئے رکھا۔[20]

شاعری اور صحافت بشیر صرفی کو میراث میں بھی ملے اور ان کا فطری میلان بھی اس طرف تھا۔ صحافت سے زیادہ اپنی شعری صلاحیتوں پر ناز تھا۔ ناز کیوں نہ ہو اپنے دادا غلام محی الدین اور والد عبد الاحد دلاور وانی بھی فارسی اور کشمیری زبان کے بہت اچھے شاعر تھے لہذا بشیر صرفی سے آغاز سے وفات تک تقریباً تین دہائیوں پر محیط اس عرصہ میں شعر و شاعری کی۔ یہ سلسلہ سن ساٹھ سے سن نوے تک جاری رہا۔ اس دوران بشیر صرفی کے یوں تو کئی مجموعے تیار ہوئے لیکن کچھ وجوہات کی وجہ سے شائع نہ ہو سکے۔ ایک وجہ قبل از وقت موت بھی ہو سکتی ہے۔ لہذ ۲۰۱۰ء تک بشیر صرفی کا جتنا بھی کلام تھا وہ ان کی ذاتی ڈائریوں تک ہی محدود رہا۔ بعد ازاں ڈاکٹر شفیق انجم نے ان کا یہ کلام بڑی تگ و دو کے بعد مرتب کر کے شائع کر دیا۔

بشیر صرفی ایک ہمہ جہت شاعر تھے انھوں نے مخلف اصناف کو اپنی شاعری میں برتا جن میں حمد، نعت، منقبت بھی شامل ہے۔ غزل ہماری شاعری کی روایت ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کوئی شخص شاعر ہو اور غزل نہ کہے بشیر صرفی کا ایک معتبر حوالہ غزل بھی ہے۔ اس کے علاوہ نظم کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ کشمیری نژاد ہونے اور ان کے خاندان کا جدوجہدِ آزادی کشمیر میں قربانیوں کا ایک بڑا حصہ ہے۔ بشیر صرفی کے والد کشمیر کی آزادی کے لئے عملی جہاد کرنے والوں میں پیش پیش رہے تو بھلا کشمیر کے لئے دی جانے والی قربانیاں اور کاوشوں سے بشیر صرفی کیسے الگ رہ سکتے تھے۔ اس لئے صحافتی سطح پر کاوشوں کے علاوہ

بشیر صرفی نے اپنی شاعری میں جدوجہدِ آزادی کشمیر کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک اچھا خاصا حصہ کشمیر کے حوالے سے نظموں پر مبنی ہے۔

ڈاکٹر شفیق انجم کی تحقیق کے مطابق تمام کلام چھوٹے بڑے سائز کی ڈائریوں اور کاپیوں پر ہے۔ وہ ڈائریاں راقمہ کی نظروں سے بھی گزری ہیں۔ پہلی ڈائری "متاعِ حیات" کے نام سے ہے یہ جون ۱۹۷۳ء میں ترتیب دی گئی۔ اس میں غزلیں، نظمیں، نعتیں شامل ہیں۔ لیکن کوئی خاص ترتیب روا نہیں رکھی گئی۔ پھر نعتوں کا مجموعہ ہے جس کا نام ورفعنہ مالک زکرک ہے۔ تاریخ درج نہیں ہے۔ اس میں "متاعِ حیات" کی بھی نعتیں شامل ہیں اور کچھ نئی بھی ہیں۔ پھر غزلوں اور نظموں کا مجموعہ "شفق" کے نام سے ہے جسے اگست ۱۹۸۹ء میں ترتیب دیا گیا۔ اس میں بشیر صرفی کا اپنا لکھا ہوا ایک مختصر دیباچہ بھی ہے مجموعے میں "متاعِ حیات" سے لی گئی غزلیں، نظمیں بھی شامل ہیں اور کچھ نئی بھی ہیں۔ انتساب اپنی تنہائی کے نام سرورق پر شاعر نے اپنا نام بشیر احمد وانی لکھا ہے۔ نعتوں کے مجموعے کا نام "اجالا" ہے۔ تاریخ ترتیب درج نہیں ہے۔ اس میں پہلے ترتیب دیے گئے مجموعہ نعت سے بھی نعتیں شامل ہیں اور زیادہ تر نئی بھی ہیں۔ کشمیر کے موضوع پر لکھی گئی نظموں کا مجموعہ "نذر جاں ہے"۔ تاریخ ترتیب نہیں۔ ایک صفحے پر مختصر کوائف دیے گئے ہیں۔ شاعر نے اپنا نام بشیر احمد وانی لکھا ہے۔ غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے "نیم شب"، کے نام سے تاریخ ترتیب نہیں۔ زیادہ تر کلام تازہ ہے۔ ان کے کلام کی ترتیب و تدوین کے حوالے سے ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

> بنیادی اور اہم مسئلہ جس نے مجھے خاصا مشقت میں ڈالے رکھا۔ وہ حتمی کلام کے تعین کا تھا بشیر صرفی بلا کے اصلاح پسند تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کو بار بار لکھا کاٹا۔ اس میں جزوی تبدیلیاں کیں۔ بسا اوقات بہت دفعہ ایسا کر چکنے پر بھی مطمئن نہ ہوئے تو مکمل طور پر خط تنسیخ کھینچ دیا۔ میں نے تدوین کے دوران ان کے انتخاب کو ملحوظ رکھا اور صرف اسی کلام کو انتخاب میں جگہ دی جسے انھوں نے بار اول یا بارِ دیگر حتمی سمجھا۔ قابل فہم تفہیم کے لئے ڈاکٹر شفیق انجم نے اس کلام کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔[۲۱]

اول: کلامِ منتخب:

اس کی مزید تین قسمیں ہیں۔ اول حمد، نعت اور منقبت، غزلیات، منظومات، یہاں وہ تمام کلام جو بہ تکرار شاعر کے انتخاب میں شامل کیا ہے۔

دوم: کلام معلق:

اس میں وہ کلام شامل ہے جو شاعر نے منتخب کیا نہ منسوخ۔ یہ زیادہ تر پہلی ڈائری متاع حیات کا حصہ ہے۔

سوم: کلام متروک:

اس حصے میں اس کلام کو جگہ دی گئی ہے جو کئی بار کی تبدیلیوں کے بعد ایک مکمل صورت میں لکھا گیا اور آخر کار ایک بڑے تنسیخی خط کے ساتھ رد کر دیا گیا یہ واضح طور پر قابلِ قرات ہے۔ اسے کلام معلق اور کلام متروک کے عنوان سے الگ شامل کیا گیا۔ ڈاکٹر شفیق انجم کے بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بشیر صرفی اپنے عہد کے ممتاز شاعر تو تھے لیکن ان کی شخصیت اور فن گوشہءگمنائی میں رہا کیونکہ آلامِ روز گار سے فرصت نہ ملنے کے باعث ان کا کلام ان کی زندگی میں چھپ نہ سکا جس کی وجہ سے متذکرہ عہد کے ادبی جائزوں اور تنقیدی مقالوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا لیکن ان کا کلام ان کی زندگی میں معتبر تھا اور آج بھی سند معتبری کا درجہ رکھتا ہے۔ اس مقالے کے ذریعے اس کمی کو پورا کیا جائے گا۔ ڈاکٹر شفیق انجم نے ۲۰۱۰ء میں ”کلام بشیر صرفی“ کے عنوان سے ان کی شاعری کے مجموعے کو ترتیب دیا ہے۔ ان کی نثری و صحافتی خدمات تاحال غیر مطبوعہ صورت میں ہیں۔

iii۔ بشیر صرفی کا معاصر ادبی منظر نامہ:

معاصر ادبی منظر نامے میں بشیر صرفی کے مقام کے تعین کے لیے ضروری ہے۔ کہ یہ دیکھا جائے کہ ان کا شمار کس دہائی کے شعرا میں ہوتا ہے۔ کون کون سے شعرا اس دہائی میں مشہور و بقول ہوئے اور ان کے

کلام کی نمایاں خصوصیات کیا تھیں اور ان معاصر شعرا میں بشیر صرفی کہاں کھڑے ہیں اس ضمن میں ڈاکٹر رشید امجد کی رائے زیادہ معتبر ہے۔وہ کہتے ہیں:

> ساٹھ کی دہائی میں جدیدیت کی جو تحریک شروع ہوئی بشیر صرفی کا تعلق اسی سے تھا انہوں نے کبھی بشیر صرفی کبھی بشیر وانی کے نام سے لکھا۔شاعری کا ذوق انہیں ورثے میں ملا تھاراولپنڈی میں نئے لکھنے والوں کا گروپ اس زمانے میں بہت سرگرم تھابشیر صرفی اس کے متحرک لوگوں میں سے تھے۔[۲۲]

بشیر صرفی سن ساٹھ کی دہائی میں ایک ممتاز شاعر، ادیب اور صحافی کی حیثیت سے میں نمایاں ہوئے اور اپنے عہد کے ادبی تحرک میں اہم اور فعال کردار ادا کیا۔ڈاکٹر روبینہ شہناز بیان کرتی ہیں:

> شعر وادب کا تعلق ان اعلیٰ انسانی اقدار سے ہوتا ہے جو ایک سطح پر آفاقی ہوتی ہیں تو دوسری سطح پر روحِ عصر کے ساتھ قدم ملا کر چلتی ہیں۔اس لیے کسی بھی ملک اور کسی بھی عہد کا ادب ہر ملک اور ہر عہد میں یکساں دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے بلکہ انسانی زندگی کے واقعات وسانحات کے آئینے میں اپنا عکس بھی دیکھا جا سکتا ہے۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر زبان کے ادب میں اس مخصوص قوم کی تہذیب وثقافت، لینڈ سکیپ سیاسی وسماجی حالات اور قومی مزاج کے عناصر بھی نمایاں ہوتے ہیں۔جس سے ادب اور ادیب کی شناخت سامنے آتی ہے۔[۲۳]

بشیر صرفی کا عہد ایک لحاظ سے سیاسی افرا تفری، اور انتشار کا دور تھا۔ پاکستانی معاشرے میں دیسی آقاؤں کی ناقص پالیسوں اور حکومت کی بے جان حکمت عملیوں نے سماجی و فکری سطح پر اس معاشرے کو مسائل سے دوچار کر دیا۔ان مسائل کو حل کرنے کے لیے مارشل لا کا سہارا لیا گیا جس سے حالات مزید سنگین ہوئے جس نے فکری وسیاسی خلا کو جنم دیا جس کی وجہ سے قومی سفر کا رخ خارج سے منقطع ہو کر باطن کی پھیر دیا گیا۔ غزل میں موضوع کے بجائے لسانی بحثوں کا آغاز ہوا چونکہ غزل کا ہیتی و تکنیکی نظام جو سال ہاسال سے بڑا مربوط تھا۔ جس کی وجہ سے ہیتی سطح پر غزل توڑ پھوڑ کا شکار نہیں ہوئی۔

غزل کا نیا دور شہزاد احمد، شکیب جلالی اور ظفر اقبال سے آشنا ہوا۔ اس دور میں لفظیات کو تو اہمیت تھی ہی لیکن باطنی سفر کو بھی نئی زبان ملی معاشرتی، معاشی اور سیاسی بحران کی وجہ سے شاعری جس بے سمتی کا شکار ہوئی تھی اس نے اجتماع کی بجائے باطن کی اہمیت پر زور دیا اور ذات کی تلاش کے پہلوؤں کو جنم دیا۔ صوفیانہ روایت میں شاعر اپنے اندر ڈوب کر ازلی مسرت سے ہمکنار ہوتا تھا کیونکہ اس کا کوئی آئیڈیل تھا۔ لیکن نیا شاعر اس عمل سے مایوسی اور تاریکی کا شکار ہوا کیونکہ اس کے پاس کوئی مثبت سمت نہیں تھی۔ معاشرتی اقدار کی توڑ پھوڑ معاشی و سیاسی سطح پر شکست نے اُس کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا تھا۔ اس کے اندر باہر خزاں کا موسم تھا۔ بشیر صرفی کی شاعری میں بھی خوابوں کی شکستگی، ذات کی تلاش، تنہائی اور خوف کے سائے منڈلاتے ہیں۔

ساٹھ کی دہائی میں حالات کی تبدیلیوں کی وجہ سے شعر و ادب میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں جس سے ایک نیا منظر نامہ سامنے آیا۔ غزل میں اسلوب اور موضوع کی سطح پر تبدیلی آئی۔ روایتی پس منظر کے ساتھ ساتھ نئی سر زمین کے نئے لینڈ سکیپ اور نئے نظریات و مسائل نمایاں ہوئے۔ جس سے پاکستانی غزل کا انفرادی مزاج سامنے آیا۔ بنیادی طور پر دو اہم غزل گو شعرا سامنے آئے جن کے اثرات آج بھی نمایاں ہیں۔ فیض کی غنائیہ رومانی شاعری اردو غزل کا کلاسیکی مزاج بناتی ہے علاوہ ازیں ان کے ہاں انقلابی نقطہ نظر بھی نمایاں ہے فیض کی شاعری کی نمایاں خصوصیات روایت کے ساتھ اپنے عصر کا ادراک ہے۔

دوسرے احمد ندیم قاسمی کے ہاں راویتی موضوعات اور پھر انسان دوستی کا رویہ ابھر کر سامنے آیا لیکن اپنی مٹی سے محبت کا رشتہ بھی ان کی اہم خصوصیت ہے۔

بشیر صرفی کی غزل میں بھی راویت کا رچاؤ، ساٹھ کی دہائی میں ہونے والی تمام تر تبدیلیوں کے حوالے سے اپنے عصر کا ادراک ملتا ہے۔ اپنی مٹی سے محبت اور رشتوں کا تقدس بھی ہے۔ اپنے لوگوں سے محبت کا احساس بھی ملتا ہے اور انقلاب کی روح نظر آتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی اور فیض کے بعد آنے والے شعرا کی ایک

طویل فہرست ہے منیر نیازی، شکیب جلالی، ظفر احمد، امجد اسلام امجد، احمد فراز، شہرت بخاری، ناصر شہزاد، اقبال ساجد، احمد مشتاق، علیم احمد اور دیگر بے شمار شعرا سامنے آئے۔

منیر نیازی، احمد شہزاد، شکیب جلالی نے غزل میں انفرادی سطح پر موضوعاتی واسلوبیاتی تجربات کیے۔ شکیب جلالی نے مسائل کو اپنی ذات پر پڑنے والے اثرات سے بیان کیا اور امجیری سے کام لینے کی کوشش کی اور نئی علامات اور استعارے وضع کیے۔

منیر نیازی کے ہاں طلسماتی کیفیت ہے۔ چیزوں کے بارے میں حیرت کا اظہار نمایاں ہے۔ صوفیانہ رنگ بھی نمایاں ہے۔ رات، آسیب، ڈر، خوف یہ الفاظ ہے یہ ڈر کہیں ان کے اندر کا ہے اور کہیں معاشرے کی دین ہے۔ بشیر صرفی کے ہاں بھی ڈر، خوف، تنہائی اور تاریکی جیسی علامات پیدا ہوئیں۔ اقبال بھی اپنے مضامین اور زبان و بیان کی بدولت قابلِ ذکر ٹھہرے۔ انھوں نے نامساعد حالات کا بیان کھلے لفظوں میں کیا۔ گویا اردو شاعری خصوصاً غزل میں ساٹھ کی دہائی ملکی مخصوص حالات، مارشل لا کا جبر، روایت کا رچاؤ، مخصوص لینڈ سکیپ، تخلیقی ذہن کی اُپج شامل ہے۔ بنیادی طور پر اردو شعرا نے اپنے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے غزل کی جمالیاتی اقدرار اور روایت سے وابستگی دونوں چیزوں پر اظہارِ خیال کیا۔

بشیر صرفی نے اس دہائی کے شعرا کی خصوصیات کلام کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ان کا شمار اردو کے روایتی اور جدید غزل گو شعرا میں ہوتا ہے بلاشبہ ہر شاعر کا کلام اس کی ذاتی سوچ اور فکر کا آئینہ دار ہوتا ہے بشیر صرفی کا کلام زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کرتا ہے اس کے تحت انھوں نے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات اور زندگی میں درپیش مصائب کو اپنی غزلوں میں بیان کیا ہے جس کی وجہ سے ان کے ذاتی دکھوں کی غمازی تو ہوگئی مگر اہم بات یہ ہے کہ ان کے دکھ ذاتی نہیں رہے بلکہ اجتماعی بن گئے یعنی ان کا کلام پڑھنے والے کو اپنا دکھ معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صلاح الدین درویش بشیر صرفی کی غزل کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

> غزل ہماری تہذیبی زندگی کا جمالیاتی اظہار ہے حیات و کائنات کے وہ تمام مظاہر جو
> پیہم تماشا سے گزرتے ہیں۔ غزل کا شاعر اپنے جذبہ واحساس اور تعلق سے کام لیتے

ہوئے اپنی شاعری میں اس کی سماجی قدر کا تعین کرتا ہے یوں غزل کا شعر ایک سطح پر کسی وقوعے یا معاملے اور منظر کی تصویر کشی کرتا ہے جبکہ دوسری سطح پر اس وقوعے معاملے یا منظر کے حوالے سے اپنے نقطہ نظر کو بھی بیان کر دیتا ہے۔ بشیر صرفی کی غزل میں ان دونوں کا کمال دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف اگر کوئی زیست کا معاملہ ہے تو دوسری طرف اس معاملے سے متعلق اپنے فہم کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ یوں دونوں مصرعے مل کر جس بیان کو سامنے لاتے ہیں وہ دعوتِ فکر دیتے ہیں۔"[24]

حوالہ شعر ملاحظہ ہو:

فکر دروازہ در کیا کرتے
ہم مسافر تھے تو گھر کیا کرتے

بشیر صرفی کی غزل کا دائرہ بہت وسیع ہے ذات و کائنات کے مسائل پر غور و فکر اپنے معاصرین کی طرح بشیر صرفی کی شاعری کا نمایاں پہلو ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری میں اس عہد کے حالات کے پسِ نظر میں پیدا ہونے والے مسائل کا عکس بشیر صرفی کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے ہاں عشق، غم ہجراں، تنہائی، انتظار، یاد، جبر، کے لہریے بارہا بنتے ہیں اور مختلف صورتوں میں ڈھل کر اپنا اظہار پاتے ہیں۔ بشیر صرفی ان حالات کے باوجود قنوطیت کا شکار نہیں ہوئے بلکہ ان کے ہاں اداسی بھی معنویت سے بھرپور ہے ان کے ہاں کرب کے بھنور کبھی ذات سے نکل کر ذات میں گم ہو جاتے ہیں کبھی عصری ماحول سے نکل کر مختلف سمعہ ے وں میں پھیل جاتے ہیں تو کبھی شاعر کے تخلیق باطن میں بسیرا کرتے ہیں بشیر صرفی کے ہاں اپنے معاصرین کی طرح علامتوں کا اظہار بھی ہے گو کہ یہ علامات کسی بڑے نظام فکر کا پتا نہیں دیتیں ان علامات میں پرندہ، پیڑ، قفس، سفر، تیرگی جیسی علامات ملتی ہیں۔

جہاں تک بشیر صرفی کی جدیدیت کا تعلق ہے تو ان کی شاعری میں ان کے معاصرین کی سی جدیدیت جو معروف معنوں میں جدیدیت ہے وہ موجود نہیں ہے البتہ ان کے ہاں عصری شعور کی عکاسی اور عہدِ موجود کے مسائل کا ادراک ضرور نظر آتا ہے گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بشیر صرفی کے ممکنہ سیاسی وادبی حدود و قیود

کے اندر رہتے ہوئے ممکنہ جدت کا اہتمام کیا ہے۔ انھوں نے شعوری اور لاشعوری طور پر ایسا شعری نظام ترتیب دیا ہے کہ وہ نہ تو روایت سے اس درجہ جڑت کا حامل نظر آتا ہے کہ ان کا ذاتی تشخص ختم ہو جائے اور نہ اتنا جدت کا حامل ہو کہ روایت سے کھلم کھلا انحراف کی سعی معلوم ہو۔

مجموعی طور پر بشیر صرفی کے کلام میں کلاسیکی رچاؤ اور جدت کا حسین امتزاج ہے۔ فنی لحاظ سے الفاظ کی تراش خراش میں ان کی مہارت لفظ لفظ سے ٹپکتی ہے۔ بشیر صرفی ویسے بھی ، ی ملیب پسند شاعر تھے ان کے کلام میں مستقل ردوبدل اور کانٹ چھانٹ اور اس کے بعد بھی شعر کے شعری و مصنوعی حسن سے مطمئن نہ ہونے پر اس کو متحروک قرار دے دینا ان کی شاعرانہ احتیاط پسندی کی علامت ہے۔ بشیر صرفی کی فارسی دانی نے ان کے کلام کو حسن اور ا ملیب بخشی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اپنی متحرک زندگی میں وہ نہ صرف جدید ادبی رویوں کے فروغ میں معاون ثابت ہوئے بلکہ اپنی شاعری میں بھی انھوں نے جدید اندازِ فکر کو فروغ دیا اس ضمن میں ڈاکٹر رشید امجد کی رائے جو ان کے مجموعہ کلام ”کلام بشیر صرفی“ کے فلیپ پر دی ہے اہمیت کی حامل ہے۔

> بشیر صرفی لکھنے والوں کی انجمن کے سیکڑیری رہے۔ جس نے نہ صرف راولپنڈی اسلام آباد بلکہ پوری اردو دنیا میں نئے رویوں کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا بشیر صرفی کی شاعری موضوعات اور فنی فکری حوالوں کے جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ اس میں غصیلے نوجوان کا فکری تناو بھی ہے اور بزرگی کی دانش بھی۔[۲۵]

بشیر صرفی نے اپنے کلام میں جدید طرز فکر کو بڑی خوبی اور مہارت سے پیش کیا اور یہی چیز غزل کے میدان میں اپنے معاصرین میں بشیر صرفی کو انفرادیت کا حامل بناتی ہے ان کی انفرادیت میں ان کے اسلوب خاص طور پر فارسی تراکیب کا مہارت سے بھرپور استعمال ان کا مخصوص رجائی لہجہ، اور آہنگ کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کا کلام قاری کو متاثر کرتا ہے ان کی غزل کی یہی خصوصیات ان کو اپنے معاصرین میں ایک الگ شناخت بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

ساٹھ اور ستر کی دہائی کی نظم کے شعرا نے ہر طرح کے تجربات کیے۔

۷۰ کی دہائی میں نظم کا جائزہ لیا جائے تو قیام پاکستان ۱۹۵۷ء کا مارشل، ۱۹۶۷ء کی عوامی تحریک ۱۹۷۷ء کا مارشل لا، اسمبلیوں کی برطرفی، ۱۹۹۹ء کا مارشل لا سب حالات وواقعات آمریت جبر کا کھیل مختلف شکلوں میں نظم میں موجود رہا۔

۷۰ کی دہائی میں سقوط ڈھاکہ کا واقعہ جس میں شاعری خصوصاً نظم میں شناخت کا بحران، عدم تحفظ، اور بے چہرگی کے احساس کو جنم دیا۔ اسی کی دہائی میں مارشل لا کے باعث مزاحمتی ادب نظم کا حصہ بنا چونکہ یہ تبدیلیوں کا عہد تھا۔ ان تبدیلیوں نے بے شمار مسائل کو جنم دیا، حساس ذہین ان تبدیلیوں کے مہ ی ءمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے ہر بات کا اظہار کھل کر نہیں کر سکے تو علامت کا سہارا لیا گیا۔ ستر اور اسی کی دہائی کی شاعری میں بے اطمینانی، خوابوں کا ٹوٹنا، خارج سے آنکھیں چرانا اور باطن میں پناہ لینا جیسے رویے پروان چڑھے۔ ساٹھ، ستر کی دہائی میں لکھنے والوں میں بشیر صرفی کا نام بھی نمایاں ہے ان کے ہاں بھی حالات کی سنگینی کے رد عمل کے طور پر مزاحمتی رویہ پیدا ہوا لیکن ان کے ہاں مزاحمتی رویہ اتنی شدت کا حامل نہیں ہے کیونکہ وہ مرکز میں نہیں تھے۔ ان کی شاعری میں روایتی رچاؤ کے ساتھ ساتھ اپنے عہد اور ہم عصر شعرا سے اثر قبول کرنے کا رویہ موجود ہے۔ بشیر صرفی کا تعلق چونکہ لکھنے والوں کی انجمن راولپنڈی سے بہت گہرا رہا۔ ان کے معاصرین میں اعجاز راہی، رشید امجد، سرور کامران، نثار ناسک، شبنم مناوری، منشا یاد، منور ہاشمی، نسیم سحر، توصیف تبسم، اشرف انصاری قابل ذکر ہیں۔

ج) بنیادی مباحث

i۔ مذہب اور شاعری:

مذہب کا تصور انسانی زندگی کے ہر دور میں رہا ہے۔ اور ہر دور میں اس کے ماننے والے موجود رہے ہیں۔ گویا انسانی زندگی کے ساتھ مذہب کا تعلق بڑا گہرا رہا ہے۔ مذہب عقیدے کا نام ہے اور عقیدے کی روشنی میں انسان اپنے معاشرتی معاملات، طرز رہن سہن اور بود وباش کو ترتیب دیتا ہے۔ دنیا میں مختلف مذاہب ہیں

اور ان کے ماننے والے بھی ہیں۔ ان سب مذاہب کے پیروکاروں میں ایک مشترک قدر ہے اور وہ قدر بنی نوع انسان کا ایک ہستی کو مان کر اس کے حضور سر بسجود ہونا اور اس کو اپنا حاجت روا ماننا ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی شہر ایسا ہو کہ جہاں کوئی مندر، کوئی مسجد، کلیسا یا عبد اور معبود کا کوئی تعلق موجود نہ ہو، یا لوگ کسی کے سامنے حاجت روائی کے لیے دعائیں نہ مانگتے ہوں۔ لوگوں کی اسی خاصیت اور طرز عمل کا نام مذہب ہے۔

لہذا تاریخ کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مذہب انسانی زندگی کا لازمہ رہا ہے اور اس کے اثرات انسانی زندگی کے ہر پہلو میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ خواہ پیدائش ہو شادی بیاہ کی تقریبات ہوں، موت ہو یا کوئی تہوار انسانی کا کوئی بھی پہلو ہو، مذہب کی کار فرمائی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ دوسری طرف ادب انسانی زندگی کا عکاس ہونے کے ناطے شب و روز پیش آنے والے واقعات کو اپنے کینوس میں سمونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر ہم ادب میں صنفِ شاعری کی بات کریں تو شاعری زندگی کے تمام تر رنگوں اور رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے ان میں ایک رنگ مذہب کا بھی ہے۔ دنیا کے ہر خطے میں ادب و شاعری اور مذہب کا تعلق ضرور ملے گا ہر شاعر خواہ وہ کسی بھی مذہب سے وابستہ ہو اپنی تہذیبی، مذہبی اور اخلاقی روایات سے کٹ نہیں سکتا اور تہذیب و اخلاق مذہب کی بنیادی تعلیمات میں سے ہیں اور تمام انسان خواہ ان کا تعلق الہامی مذہب سے ہو یا غیر الہامی سے۔ الہامی سے مراد وہ کلام جو وحی کے ذریعے نازل ہوا۔ اس میں عیسائیت اسلام اور یہودیت شامل ہیں اور غیر الہامی مذہب سے مراد وہ تہذیبی و اخلاقی ضابطہ حیات جو انسانوں کا ترتیب دیا ہوا ہے اپنے ہر کام کا آغاز مذہب کے حوالے سے کرتے ہیں کیونکہ انسان فطری طور پر مذہب کو زندگی کے ہر کام میں شامل کرنا ضروری خیال کرتا ہے۔

جب ہم مذہب اور شاعری کے تعلق کی بات کرتے ہیں تو جہاں شاعری میں زندگی کے دیگر مسائل کو زیر بحث لایا جاتا ہے وہاں مذہب پر بھی اظہار خیال ملتا ہے۔ کیونکہ مذہب نام ہے ایمان کا، عقیدے کا، احکام و قوانین کا اور عمل کا۔

در حقیقت جسم و روح دو چیزوں سے عبارت ہے۔ جسم روح کا لباس ہے اور انسان ہر دو جسمانی و روحانی ضروریات کا حامل ہے۔اور ان دونوں قسم کی ضروریات کو پورا کرنے کے اپنے اپنے طریقے ہیں۔ جس طرح انسان اپنی جسمانی ضروریات مثلاًخوراک،لباس،رہائش وغیرہ کے ملنے پر آسودگی اور خوشی کا اظہار کرتا ہے اسی طرح وہ اپنی روحانی ضروریات کو پورا کرنے کا بھی آرزو مند ہوتا ہے اورانسان کی روحانی ضرورت مذہب سے پوری ہوتی ہے۔ انسان کو روحانی وباطنی سکون اور اطمینانِ قلبی مذہب باہم پہنچاتا ہے۔ کیونکہ مذہب کا تعلق فطرت سے ہے اور فطری طور پر انسان کے ذہن میں ہوش سنبھالتے ہی کچھ سوالات ابھرتے ہیں کہ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ اس کا خالق کون ہے؟ اس کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ یہ کائنات کیوں ہے؟ کیسے ہے؟ یہ سب نظامِ کائنات کون اور کیسے چلا رہا ہے؟ اُن سب سوالوں کا جواب مذہب مہیا کرتا ہے لہذا مذہب کی اہمیت سے انکار یکسر ممکن نہیں۔ جب ہم انسانی زندگی کو مختلف ادوار میں تقسیم کرتے ہیں تو پتھر کا دور، پھر فلفسہ و مذہب اور پھر سائنسی دور میں منقسم کرتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب کا تصور ہر دور میں ضرور موجود رہا ہے۔ مذہب انسان کو اس کی حقیقت، خالقِ کائنات اور غرض تخلیق جیسے سوالات کے جوابات سے روشناس کراتا ہے۔

مذہب اور شاعری کے تعلق کے بارے میں عارف حسین بیان کرتے ہیں:

> مذہب اور شاعری میں تنافی کی نسبت نہیں ہے کہ یہ کہا جاسکے کہ جہاں شاعری ہے وہاں مذہب نہیں آسکتا یا جہاں مذہب ہے وہاں شاعری نہیں آسکتی بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو مذہبی کتابیں کسی حد تک شعری ہیتوں میں ہیں جیسے مہابھارت، انجیل مقدس اور خاص کر قرآن کا اعجاز ہے کہ جہاں نثری کتاب ہے تو وہاں شعری رنگ و آہنگ سے معمور ہے جیسے و ۔ لضحیٰ والیل اذا سجی ما ودعک ربک وما قلیٰ۔[27]

مذہب میں دو چیزیں بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ عقیدہ اور عمل، عقیدے کا تعلق انسان کے باطن یا اس کے وجدان سے ہے اور عمل کا تعلق انسان کے ظاہر اور اعضا سے ہے۔ عقیدے کی بنا پر انسان واجب الوجود سے اپنا تعلق جوڑتا ہے اور عقیدے کی عملی صورت انسان کا عبدیت کے مرتبے پر فائز ہونا

ہے۔ انسان تخیل کی قوت سے ماورا اپنا تعلق قائم کرتا ہے۔ شاعری میں بھی جذبے اور تخیل کی کار فرمائی ملتی ہے۔ شاعری اور مذہب میں بھی تخیل کی اسی کار فرمائی کے بارے میں الف۔ د۔ نسیم لکھتے ہیں:

> مذہب اور اخلاقیات بھی آرٹ کی طرح واقعات اور اشیا کی ترجمانی اس طرز پر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایک ہیجانی اور جذباتی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ ہم ان کے مسلمات کے آگے بلا تامل سر تسلیم خم کر سکیں۔ مذہب جس کا مقصد ایک مقررہ نظام کے تحت خود اپنے سے برتر کسی اور ہستی کا ذہنی یا وجدانی ادارک ہے۔ شاعری کی طرح ایک حد تک جذبہ اور تخیل کا محتاج ہے۔ ایک آدمی جب مذہب کے دیگر فرائض و حقوق سے الگ صرف خدا یا اس کے مظہر کی جسے وہ خدا مانتا ہے۔ ذات و صفات کے ادارک کی کوشش کرتا ہے تو لازما یہ ایسی قوتِ یمہء . یلہ سے کام لیتا ہے اور جب وہ اپنے خیال میں اس ہستی کا کوئی نہ کوئی نقش قائم کر لیتا ہے تو اس کے جذبات میں اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے جس کا اظہار وہ مناجات، دعا اور عبادات کے ذریعے کرتا ہے جب وہ ذہن میں خیال کی بنائی ہوئی مختلف شکلوں کو خارجی شکل دیتا ہے جو حقیقت میں اس کے داخلی خیالات و جذبات کا عکس ہوتے ہیں۔ بت پرست قوموں مثلاً ہندو، بدھ، جینی، کیتھولک، عیسائی اور دیگر مشرکین اور کفار کے ہاں بتوں کی صورتوں کے تنوع اور تلون کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ہستی برتر کی حقیقی شکل کی بجائے مختلف لوگوں کے تصور کی خارجی صورتیں ہوتی ہیں۔
>
> قرآن مجید لیس یمہلہ شی۔[۲۸]

مسلمان برصغیر میں فاتح کی حیثیت سے آئے اور مذہب اسلام کا اعجاز ہے کہ مسلمانوں نے اپنی انفرادیت قائم رکھی وگرنہ دیگر بہت اقوام ہندو مذہب میں مدغم ہوگئیں لیکن مسلمان اپنے ساتھ تہذیب، ثقافت اور فنون لائے۔ مسلمانوں نے دیگر علوم وفنون کے ساتھ اردو شعر و ادب کو بھی فروغ دیا۔ ان کے دور میں شاعری عروج پر تھی۔ مسلمان حکمرانوں کے شعری ذوق کے باعث عربی فارسی اسالیب، حمد نعت منقبت رواج پاگئےیکا اثر تھا کہ شاعری میں قرآن وحدیث کا مفہوم و متن ، ی ملہیہی، استعارہ، اسلامی لفظیات کو ہندوستانی شعرا نے اپنایا۔

مسلمانوں کے مخصوص مذہبی تصورات نے اردو شاعری میں موضوعات و اسالیب کی سطح پر گہرے اثرات چھوڑے۔ شاعری میں اعلیٰ پائے کی شعری تخلیقات وجود میں آئیں جن میں مذہبی وصوفیانہ جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔ اردو شاعری کی مذہبی، ثقافتی اور تہذیبی روایت ہے کہ مسلمان شاعر یا ادیب حمد، نعت یا منقبت سے اپنے کلام کا آغاز کرتا ہے۔ دیوان کا آغاز حمدیہ اور نعتیہ اشعار سے احادیث، آیات اور بزرگان دین کے مقالات کے مضامین باوند ھنابی و دینی تعلیمات و ر یش سہ ہیات و لفظیات اور ان سے موضوعات میں تنوع پیدا کرنا انہی مذہبی تصورات کی دین ہے۔ عشق کے اظہار میں اخلاقی اقدار کی پاسداری مرد کی طرف سے اظہارِ عشق اور ہجو گوئی میں بھی اعتدال کا دامن نہ چھوڑنا، تصوف کی بنا پر عشق مجازی میں جذبات و خیالات کی پاکیزگی کو قائم رکھنا تصوف کی بنا پر روحانیت کی فضا، عرفان و معرفت، فلسفہ و حکمت کے مضامین مذہبی اثرات کا نتیجہ ہیں اور پھر رزمیہ، عشقیہ، سیاسی و قومی شاعری میں بھی رنگ آہنگ موجود ہے۔ اردو شاعری میں اخلاقی مضامین کو کثرت سے اپنایا گیا جس وجہ سے ر ی میدیلہ شاعری اور مرثیے کو بھی فروغ ملا۔

گویا ہندوستانی شعرا اپنی شاعری میں مذہبی جذبات کا اظہار اپنے لیے باعثِ رحمت تصور سمجھتے تھے۔ قصیدے اور مرثیے کی اصناف بھی مذہبی جذبات کے اظہار کی صورتیں ہیں گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو شاعری کا آغاز ہی مسلمان حکمرانوں کے زیرِ اثر مذہبی وصوفیانہ خیالات کے اظہار سے ہی ہوا مذہب اور اردو شاعری کے تعلق کے حوالے سے تفصیلی بحث دوسرے باب میں ہو گی۔

ii۔ رومان اور شاعری:

رومان در حقیقت کسی ایک مربوط شے یا چیز کا نام نہیں ہے اور نہ ہی رومان انسان کے مشاہدے یا تجربے میں آنے والی کسی ٹھوس شے کے اظہار کا نام ہے۔ رومان کا لفظ در حقیقت اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے۔ رومانویت کی کئی صورتیں ہیں مثلاً انسانی زندگی میں خوبصورتی کی بڑی اہمیت ہے۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ خوبصورتی کو سراہتا ہے۔ حسین اور خوبصورت چیزوں کے بارے میں ذہن میں ایک معیار قائم کرتا ہے یا

اس کا تصور اپنے ذہن میں لاتا ہے۔ پھر چیزوں کو اظہار کی صورت میں لاتا ہے یا تخلیق کرتا ہے اس پہلو کو رومان سے منسوب کیا جاتا ہے یعنی ایک سطح پر حسن اور عشق کا اظہار رومانویت ہے۔

اسی طرح پرانے زمانے میں داستانوں کا چلن عام تھا داستانوں کے ذریعے بادشاہوں، وزیروں، شہزادوں اور شہزادیوں کے قصے اور دیومالائی کرداروں، جنگوں کے احوال اور عیش پرستی کی داستانیں سنائی جاتی تھیں جو عام انسانوں کے تجربے یا مشاہدے سے ماورا تھیں۔ ایسی زندگی کے بارے میں تصور کو بھی رومان سے وابستہ کیا جاتا ہے پھر انسان کے مذہبی عقائد اور ان کی الہامی صورتیں جیسے ان دیکھے خدا پر ایمان، الہامی کتابوں پر ایمان، معجزات کا ماننا اور دیگر تمام تر مذہبی عقائد کو بھی رومان کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے پھر یوٹوپیا کا خواب بھی رومان کی ایک صورت ہے۔

ایبابیاں۔ آر۔ فہرست نے بیان کیا ہے:

> رومانویت کا جہاں تب نمودار ہوتا ہے جب فطرت سے انسان کا رشتہ کٹ جائے وہ مرکز کائنات نہ رہے خود کو تن تنا محسوس کرے۔ فطری طور پر قوت یمہء . یلہ کو بروئے کار لا کر بہتر اور خوب تر جہان کے خواب دیکھتا ہے۔[۲۹]

انیسوی صدی کے آخر میں مشینی دور کے آغاز اور سائنسی عقلیت پسندی نے انسان کی انفرادیت کو ختم کر کے اجتماعیت کی طرف مائل کیا۔ جس سے انسان کی وقعت ختم ہوئی وہ بے چہرہ ہوا۔ اس کا تعلق روحانی سرچشموں سے ختم ہوا۔۔ اس کی شناخت کا مسئلہ پیدا ہوا اتو اپنی ذات کی تلاش کے لیے وہ نئے سرے سے مائل ہوا تو عقل کی بجائے جذبے اور تخیل کو اہمیت دی جانے لگی خواہشات کی تکمیل ناآسودگی میں راحت کے حصول کی جدوجہد اور حقیقت سے آنکھیں چار کرنے کے بجائے اس سے فرار کی کوشش ان چیزوں کے حصول کے لیے تخیل کی کارفرمائی اور جذبے کا اظہار بھی رومان ہی کی صورت ہے گویا رومان کے بنیادی عناصر میں حسن و خوبصورتی عیش پرستی، انفرادیت کا احساس، انفرادی زندگی کا تصور جذبے اور تخیل کی کارفرمائی، فطرت پرستی، وطن پرستی اور انسانی تخیل کی مدد سے تراشیدہ اساطیر، اور لوک کہانیوں سے لگاؤ اور دیومالائی

عناصر کی اہمیت، شرکت اور انداز بیان، حقیقت سے فرار اور زبان و بیان میں نئے اور علامتی اسلوب کا اظہار اور اظہار کے لیے نئے تجربات سب شامل ہیں۔

رومان کا لفظ وسیع تر معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس میں زندگی کی تمام تر قدروں اور پہلوؤں کو سمویا جاتا ہے یہی رومانوی عناصر باقاعدہ ادب میں ایک تحریک کی صورت میں جلوہ گر ہوئے جسے رومانوی تحریک کا نام دیا گیا۔

فرخندہ لودھی رومان کے بارے میں لکھتی ہیں:

میرے نزدیک "رومان" غیر واضح مبہم مگر مثبت کیفیت کا نام ہے ایک ایسے احساس کا نام جو فرد کو مادی آلائشوں سے ماورا، تخیل کے روپہلے، عنکبوتی تاروں سے بنے ہوئے جھولے میں جھولاتا ہے۔ اس کا تجربہ اس انسان کو نہیں ہو سکتا جس کے پاؤں کسی ملائم مہک دار مٹی پر نہ ہو بلکہ مفادات کی دلدل میں دھنسے ہوں۔ ایسا انسان رومان کی معطر فضاؤں کے مزے لے ہی نہیں سکتا "رومان" وجود کے ساتھ عدم و جود الہیاتی صورت ہے جو نامکمل کے احساس سے تکمیل کے مراحل کا سفر ہے میرے نزدیک پھول، جھرنا، بال، برکھا، بچے، بالغ اور بوڑھے انسان کی بے لوث مسکراہٹ سب رومان ہے۔ گھنیرے جنگلوں میں سورج کی کرنوں کا طلسماتی کھیل، چاند کی ٹھنڈی نرم چاندنی، گاڑی کے پہیوں کے مترنم اور متوازن سُر کسی پاکیزہ معصوم شے کو بے ساختہ چوم لینے کی خواہش کسی بلندی کو تصور میں سر کر لینے کا جنون یہ سب کیا ہیں؟ میں ان تمناؤں اور تجربوں کو "رومان" کہتی ہوں۔[۳۰]

گویا رومان لاحاصل کی خواہش اور پھر اس خواہش سے حظ حاصل کرنے کی منزل سے بھی کہیں زیادہ دلکش ہے۔

ڈاکٹر محمد خان اشرف رومانونیت اور ادب کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

رومانویت فن و ادب کی تاریخ کا ایک ایسا کثیر الجہتی مظہر ہے جو نہ صرف مغربی یورپ کی اٹھارویں اور انیسویں صدی کے فکر و فن کی تاریخ پر محیط ہے بلکہ اس کے اثرات

> اس دور کے بعد کے فکر و فلسفہ اور تہذیب و تمدن پر بھی مرتب ہوئے۔ رومانویت صرف ایک ادبی تحریک ہی نہیں تھی بلکہ عقلیت، روایت اور نظم وضبط کے اصولوں کے خلاف ایک ایسی ہمہ گیر بغاوت تھی جس کے اثرات معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی، اصلاحات کی صورت میں بھی ظاہر ہوئے ادب وفن پر نہایت گہرے اثرات مرتب ہوئے اور رومانویت کلاسکیت کی مد مقابل بطور ایک "فنی قطب" کے آموجود ہوئی یہاں تک کہ بعد کی ہر فنی وادبی تحریک ان دونوں میں سے کسی ایک سے وابستہ سمجھی گئی۔[۳۱]

رومان و ادب خصوصاً شاعری کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ رومان کے مفہوم کی وضاحت میں یہ ذکر کیا گیا کہ رومان میں خوبصورتی یا حسن کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اسی طرح شاعری میں بھی حسن وجمال کو سراہا جاتا ہے اردو میں ایسی تحریروں کو رومانوی کہا گیا ہے جن میں شاعرانہ اسلوب اختیار کیا گیا اور جو شاعری ذوقِ جمال کی آئینہ دار ہے شاعری اگر جذبات و احساسات کے اظہار کا نام ہے تو رومانویت کا تعلق بھی جذبے، تخیل اور احساس سے ہے۔ اگر فطرت سے وابستگی یا فطری حسن سے لگاؤ رومانویت ہے تو شاعری بھی فطرت کے ذکر اور اس کی جولانیوں سے تہی دامن نہیں ہے۔ اقبال اور وڈزورتھ کی شاعری فطرت اور رومان کی بہترین مثال ہے اگر رومان انسان کے جوش وولولے جذباتی وذہنی اور روحانی آسودگی اور ترفع کا نام ہے تو شاعری بھی انسان کے جذبات کی تقویت کا نام ہے۔ رومانوی اثرات باقاعدہ تحریک کی صورت میں نمایاں ہوئے جن کا اظہار ادب و شاعری میں مغربی و مشرقی شعرا اور ادیبوں کے ہاں نمایاں ملتا ہے رومانوی تحریک اور رومانی شعرا کے بارے میں تفصیلی ذکر تیسرے باب میں کیا جائے گا۔

iii۔ انقلاب اور شاعری:

> انقلاب عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ "قلب" ہے اور مادہ بمعنی "الٹنا، پلٹنا (نیچے کا اوپر کرنا، دائیں کا بائیں کرنا، اندر کا باہر کرنا یا اس کے بر خلاف) بر عکس کرنا، اوندھا کرنا، حالت بدلنا کے استعمال ہوتا ہے اور لفظ انقلاب کا لغوی معنی "تبدیلی"، نظام

حکومت کی اچانک تبدیلی (سیاسی یا فوجی) انقلاب" وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔[32]

مندرجہ بالا مفہوم کے مطابق لفظ انقلاب سے مراد حکومت کا تختہ الٹنے، حوصلہ و ہمت کرنے، یکدم بدلنے یا کسی نظام سے دلبرداشتہ ہو کر اس کے خلاف کمر کس لینا، تبدیلی کی یہ کیفیت آہستہ آہستہ اور وقفے وقفے سے ہو تو وہ انقلاب نہیں بلکہ ارتقا کی صورت ہو گی کیونکہ انقلاب نام ہے عمل اور جذبے کی شدت کا، مر مٹنا، جان کی بازی لگا دینا اور لہو بہانے کا جذبہ، انقلاب پسندوں کی اہم خصوصیت ہے۔

آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق حکومت کا تختہ الٹنے یا حکومت کی تبدیلی کی تحریک کو انقلاب کا نام دیا گیا ہے انگریزی میں اس کے لیے "Revolation" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

[33] Revolation Motion in the consititution of government.

انقلاب در حقیقت رائج الوقت نظام سے بغاوت اور نئے نظام کو اپنانے کا نام ہے کسی بھی ملک، قوم یا معاشرے میں انقلاب کی صورت اس وقت ظہور پذیر ہوتی ہے کہ جب فرسودہ نظام کو لوگوں پر مسلط کیا گیا ہو یا کسی طبقے کے حقوق کی پامالی کی گئی ہو یا کسی قسم کی قانونی، سیاسی، معاشرتی لحاظ سے حق تلفی کی گئی ہو، تو پھر لوگ بغاوت پر آمادہ ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں انقلاب برپا ہوتا ہے۔ اردو میں "تختہ الٹنا" کا محاورہ در حقیقت انقلاب ہی ہے۔ حکومتِ وقت کی پالیسیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا یا آواز بلند کرنا "بغاوت" ہے اور اگر بغاوت کی اس آواز کو وسیع سطح پر قبولیت کا درجہ حاصل ہو جائے تو وہ انقلاب کہلاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کامیاب بغاوت انقلاب ہے اور ناکام انقلاب بغاوت ہے۔

اگر ہم انسانی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ انسانی فطرت ہے۔ ہر دور میں ہر معاشرے میں کسی نہ کسی سطح پر کسی نہ کسی طبقے کا استحصال ہوتا آیا ہے اور اس کے خلاف ہر عہد میں لوگ اپنے آقاؤں کے خلاف علمِ بغاوت بھی بلند کرتے آئے ہیں۔ بغاوت کی بھی دو صورتیں ہیں ایک ظاہری و عملی صورت اور دوسری شعوری بغاوت، عملی بغاوت میں تو لوگ میدان میں آکر جان کی پروانہ کرتے ہوئے اپنے ساتھ ہونے

والے جبر کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں دوسری قسم کی بغاوت میں جسے سرد انقلاب یا شعوری بغاوت کہا جاتا ہے۔ شاعر یا ادیب اپنے قلم اور تحریروں کے ذریعے پے در پے عوام کو ظلم و جبر یا استحصال کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تحریک دیتے رہتے ہیں۔ یہ عمل کڑا اور صبر آزما ہوتا ہے مگر جب عوام شعوری طور پر بیدار ہو جاتے ہیں تو انقلاب کی راہیں ہموار ہونے لگتی ہیں گویا ادیب یا شاعر عوام میں جبر و تشدد یا استحصال کے خلاف شعور بیدار کرنے کے لیے جو کچھ لکھتے ہیں اسے انقلابی ادب کہا جاتا ہے جس میں ایک عام آدمی سے لے کر اعلیٰ سطح تک کے لوگوں کی سفاکی اور بے رحمی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دنیا میں بیشتر انقلاب جو برپا ہوئے اس کے پس پردہ ایک محرک ادب اور شاعری کا بھی رہا ہے جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ انقلاب برپا کرنے میں ایک شعوری کاوش ہوتی ہے یعنی عوام کو میدان عمل میں لانے اور انھیں بیدار کرنے کے لیے عوامی شعور کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ شعور کو اُجاگر کرنے کا ایک طریقہ ادب و شاعری بھی ہے یعنی ایسا ادب تخلیق کیا جاتا ہے جو عوام کے جذبات کو تحریک دیتا ہے گویا شاعری یا ادب کے ذریعے کسی انقلابی نظریے کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ ادبی انقلاب وہ ہے جس میں احتجاج کی قوت ہو اور ظالم کو برملا ظالم کہنے کی صلاحیت موجود ہو۔

انقلابی شاعری کے ذریعے جب عوام اپنے حقوق کے حصول کی خاطر بیدار ہوتے ہیں تو ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو کسی بھی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

انقلاب زندگی میں بہتری اور تبدیلی لانے کا نام ہے تو اس صورت میں انقلاب اور ادب و شاعری لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔ انقلابی ادب اپنے مدھر گیتوں، نغموں، شعروں اور لفظیات سے عام آدمی کے باطن کو جھنجھوڑتا ہے۔ اسے زندگی کا مقصد و مفہوم سمجھاتا ہے۔ زندگی سے حظ اُٹھانے پر مائل کرتا ہے، لہٰذا ادب ہی زندگی کی اصل حقیقی شکل کو واضح کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کے مقاصد اور ادب کے مقاصد جب ایک ہو جاتے ہیں تو انقلابی ادب اپنی پوری تاثیر اور روح کے ساتھ وجود میں آتا ہے۔

اختر حسین رائے پوری بیان کرتے ہیں:

ایک ادیب اور انسان کے فرائض یکساں اور مشترک ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک اپنے ماحول کی ترجمانی کرتا ہے اور دوسرا اس سے متاثر ہوتا ہے۔[۳۴]

ادیب یا شاعر اپنے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ معاشرے اور ماحول سے ہی اثر قبول کرتا ہے اور پھر چیزوں پر اپنی افتاد طبع کے مطابق اظہار خیال کرتا ہے۔ شاعری جذبات کی عکاسی کا نام ہے اور جذبات حالات اور وقت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں، کبھی خوشی کبھی غم، کبھی غضب ناکی، کبھی غربت و افلاس، اور موت و حیات کے مسائل ہر دو طرح کے مسائل میں سماج اور قدرت ملوث ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو شاید یہ مسائل بھی نہ ہوں۔ یہی نکتہ ہے جو انقلابی ادب کے تخلیق ہونے کی وجہ بنا۔ موت تو خدا کی طرف سے ہوتی ہے جیسے انسان برداشت کر لیتا ہے لیکن حقوق کی پامالی اور غربت و افلاس سماج کی دین ہے۔ گویا شاعر یا ادیب کو انقلابی شاعری یا ادب پر معاشرہ آمادہ کرتا ہے۔ مختصر یہ انقلابی ادب ماحول میں پیدا ہونے والی مذہبی رسومات، جبر، کم فہمی شعور کی پسماندگی کڑی روایات کے باوجود ایک دائرے کا اسیر ہو کر رہنے سے انکار اور اپنے حقوق کے غاصبانہ سلب ہونے پر اعتراض کرنا گویا اعلان جنگ ہے یہی اعلان جنگ شاعری میں علامتوں کنائیوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں:

زندگی قائم و دائم ہے اور انسان لاشریک لہ اس کا مالک ہے۔ انسان اور قدرت کی کش مکش کا نام تہذیب ہے۔ انسانیت کی ترقی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کس حد تک قدرت پر فتح حاصل کر لی ہے۔ انسان سب سے افضل اور اکمل ہے دینِ حق کا مطلب ہے ہر قسم کے ظلم کا سد باب اور اخوت و مساوات کا قیام، قومیت، سرمایہ کاری، تمیز رنگ نسل اور تفریق مذاہب وہ انسانیت کے لیے سمِ قاتل سمجھتا ہے اس کے خیال میں ایک نسل کو دوسری نسل کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہر آنے والی نسل زندگی کی محافظ اور ضامن ہے۔[۳۵]

اس اقتباس سے انقلاب اور شاعری کے تعلق کا پتا چلتا ہے۔ انقلابی شاعری انسانیت کی خدمت کے مقدس فرض کو نبھاتی ہے۔ اپنی ذات کے دائرے میں مقید رہنے کے بجائے خیالات کی بلندی اور تقدیر پر

شاکر رہنے کے بجائے تدبیر پر اکساتی ہے اور تفریق کو مٹانے اور آپس میں باہمی ربط و یگانگت اور بھائی چارہ کے فروغ میں معاون ہوتی ہے۔ گویا انقلاب اور شاعری دونوں کا مقصد معاشرے میں تبدیلی لانا ہے۔ دونوں اربابِ اقتدار کی کوتاہیوں، عوام کے استحصال اور جبر و استبداد پر صدا بلند کرتے ہیں۔ انقلاب اور شاعری پر تفصیلی بحث چوتھے باب میں کی جائے گی۔

حوالہ جات

۱۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، مقدمہ کلام بشیر صرفی، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰

۲۔ بشیر صرفی کی بہن فہمیدہ بانو سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام جی/۱۳، اسلام آباد، بتاریخ ۲۶ دسمبر ۲۰۱۸ء، بوقت ۶ بجے شام

۳۔ بشیر صرفی کے بھانجے اطہر وانی سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام رہائش گاہ سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی، بتاریخ ۱۰ جنوری ۲۰۱۹ء، بوقت ۱۰ بجے رات

۴۔ بشیر صرفی کی بہن فہمیدہ بانو سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام جی/۱۳، اسلام آباد، بتاریخ ۲۶ دسمبر ۲۰۱۸ء، بوقت ۶ بجے شام

۵۔ بشیر صرفی کی بہن حفیظ وانی سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی، بتاریخ ۲۵ جنوری ۲۰۱۹ء، بوقت ۵ بجے شام

۶۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، مقدمہ کلام بشیر صرفی، ص ۱۵

۷۔ ایضاً، ص ۱۵

۸۔ بشیر صرفی کے بھانجے اطہر وانی سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی، بتاریخ ۱۰ جنوری ۲۰۱۹ء، بوقت ۱۰ بجے رات

۹۔ بشیر صرفی کی اہلیہ نگہت بشیر سے راقمہ کا انٹرویو، جی/۱۳ اسلام آباد، بتاریخ ۲۶ دسمبر ۲۰۱۸ء، بوقت شام ۶ بجے

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ بشیر صرفی کے بھانجے اطہر وانی سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی، بتاریخ ۲۲ جنوری ۲۰۱۹ء، بوقت ۵ بجے شام

۱۳۔ اشرف انصاری سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام نمل، بتاریخ ۲۰ فروری ۲۰۱۹ء، بوقت ۱۱ بجے صبح

۱۴۔ ڈاکٹر منور ہاشمی سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام وفاقی اردو یونیورسٹی اسلام آباد، بتاریخ ۴ فروری ۲۰۱۹ء، بوقت ۱۰ بجے شام

۱۵۔ بشیر صرفی کی اہلیہ نگہت بشیر سے راقمہ کا انٹرویو، رہائش گاہ جی/۱۳ اسلام آباد، بتاریخ ۶۲ دسمبر ۲۰۱۸ء، بوقت شام ۶ بجے

۱۶۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، مقدمہ کلام بشیر صرفی، ص۱۶

۱۷۔ بشیر صرفی کے بھانجے اطہر وانی سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام سیٹلائٹ ٹاون، راولپنڈی، بتاریخ ۲۲ جنوری ۲۰۱۹ء، بوقت ۵ بجے شام

۱۸۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، مقدمہ کلام بشیر صرفی، ص۲۰۔۱۹

۱۹۔ رشید امجد، ڈاکٹر، تمنا بے تاب، حرف اکادمی، راولپنڈی، ۲۰۰۳ء ص۹ ۶

۲۰۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، مقدمہ کلام بشیر صرفی، ص۱۹۔۱۸

۲۱۔ ایضاً، ص۱۹۔۱۸

۲۲۔ رشید امجد ڈاکٹر۔ کلام بشیر صرفی، مرتب، شفیق انجم، ڈاکٹر، بیک فلیپ

۲۳۔ روبینہ شہناز، ڈاکٹر، اردو تنقید میں پاکستانی تصورِ قومیت، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، اسلام آباد، طبع اول ۲۰۰۱ء، ص۵۱

۲۴۔ صلاح الدین درویش سے راقم انٹرویو، بمقام ایچ نائن بوائز کالج، اسلام آباد، بوقت ۳:۰۰ ۱۰ صبح، ۱۲ فروری ۲۰۱۹ء

۲۵۔ رشید امجد، ڈاکٹر، کلام بشیر صرفی، مرتب، شفیق انجم، ڈاکٹر، ۲۰۱۰ء، بیک فلیپ

۲۶۔ عارف حسین، پاکستانی اردو غزل میں مذہبی استعارے: تحقیق و تجزیہ،، مقالہ ایم۔فل اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

۲۷۔ الف۔ د۔ نسیم، اردو شاعری کا مذہبی و فلسفیانہ عنصر، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۰ء، ص۱

۲۸۔ ایضاً، ص۲۳

۲۹۔ صباحت قمر (مترجم)، رومانویت، (ایک تنقیدی اصطلاح)، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۵، ص۲۱

۳۰۔ فرخندہ لودھی، رومان کی موت، دستاویز مطبوعات، لاہور، طبع اول، ۱۹۹۷ء، ص۱۱

۳۱۔ محمد خان اشرف، ڈاکٹر، ابدہاد تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، الوقار پبلی کیدیسہ . مر، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۹

۳۲۔ وحید الزمان، مولانا، القدوس الوحید، ادارہ اسلامیاتیسہ . مر، دہلی، ۲۰۰۱ء، ص۵۳۳

۳۳۔ آکسفوڑکشڑنری، اور ییلِ بک سوسائٹی، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص۵۳۳

۳۴۔ اختر حسین رائے پوری، ادب اور زندگی، مطبع انجمن ترقی اردو، دکن، ۱۹۳۵ء، ص۲۵۶

۳۵۔ ایضاً، ص۹۶

دوسرا باب:

بشیر صرفی کی شاعری میں مذہبی عناصر کا تجزیہ

الف) مذہب اور اردو شاعری:

اردو زبان وادب کے ارتقا کا دور برصغیر میں مسلمان فاتحین اور مبلغین کی آمد، ان کے قیام اور استحکامِ حکومت اور ان کے تہذیب وتمدن سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔یہی وجہ ہے اردو شاعری میں مذہبی اورروحانی اقدار کا مشرقی تہذیبی روایات سے رشتہ بڑا مربوط اور گہرا ہے۔اگر ابتدا سے اردو شاعری کا جائزہ لیا جائے تو مذہبی عناصر اور صوفیانہ روایات ضرور ملیں گی۔ جن کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سرزمین ہند کو صوفیانہ وروحانی اقدار بڑی راس آئیں۔یہی وجہ ہے کہ تصوف سے فکری سطح پر اختلاف رکھنے والے بھی شاعری میں اس پہلو سے صرفِ نظر نہیں کر سکے۔

تصوف کی روایت اردو شاعری میں فارسی کی دین ہے اور فارسی شاعری میں دیگر وجوہات کے ساتھ ساتھ خیال کی کمی کے باعث بھی مذہبی وروحانی روایت کا چلن ہوا۔ اردو شاعری میں بھی اسی روایت کا چلن ہوا۔ ہمارے کلاسیکی شاعروں میں شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس کے ہاں یہ روایت مستحکم نہ ہوئی ہو۔

اردو شعر وادب کا آغاز دکن سے ہوا۔اس سے قبل شاعری کے فروغ میں صوفیا کرام اور اولیا کا بڑا ہاتھ ہے،انہوں نے رشدوہدایت کے لیے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا۔اس عہد کی مثنویوں میں بھی نعتیہ اشعار مثنوی کی روایت میں بکثرت ملتے ہیں۔

صوفیا کرام میں خواجہ معین الدین چشتی نے شروع میں خلفا کے ملفوظات کی تالیفات کرتے ہوئے ہندی الفاظ کا استعمال کیا۔ بعد ازاں چراغ دہلوی، سرور الصمد، شیخ حمید الدین ناگوری سے ایسے اشعار منسوب کیے جاتے ہیں۔ جسے ہندی اردو کی ابتدائی کوشش قرار دیا جا سکتا ہے۔بھگتی تحریک کے شعرا میں بھگت کبیر نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے اخلاقی وروحانی عناصر کا پرچار اپنی شاعری میں کیا۔

حمید الدین ناگوری وسطی ہند کے "بو علی قلندر" پنجاب اور ہریانہ سے "خسرو" دہلی سے اور "شیخ عبدالقدوس گنگوہی" اودھ سے اس دور میں ان صوفیا کرام نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

دکنی دور میں مرثیوں اور نوحوں اور میلاد ناموں کی روایت خصوصیت سے ملتی ہ ۔کیونکہ قطب شاہی اور عادل شاہی عہد کے سلاطین کا جھکاؤ اثنا عشری مذہب کی طرف تھا۔شاعری کا یہ ذریں دور ۱۷۷۰ءتک اور اورنگیزیب عالمگیر کے عہد تک جاری رہا دکنی دور میں صوفیا اور اولیا کے بعد آنے والے شعرانے اپنی روایت پر چلتے ہوئے غزل میں بھی مذہبی اور صوفیانہ رنگ اختیار کیا۔مثنویوں کی ابتدا حمدیہ اور نعتیہ کلام سے ہوئی۔قطب شاہ کو غزل کے رنگ میں نعت کہنے والا پہلا شاعر کہا گیا۔قبل ازیں نظامی کی مثنوی "کدم راؤپدم" میں بھی نعتیہ اشعار ملتے ہیں گویا دکنی دور حکومت میں تخلیق ہونے والی تقریباً تمام تر شاعری میں خصوصاً مسلمانوں کے ہاں شعرانے اپنے کلام کا آغاز خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے کیا اس لیے یہ کہا جاتا ہے۔شمالی ہند میں اردو شعر و ادب کے فروغ سے بہت پہلے اردو شاعری میں مذہب کو اولیت حاصل رہی دکنی شعرا میں نصرتی،وجہی، غواصی، طبعی، فیضی کے ہاں نعتیہ کلام قصائد، قطعات اور ابیات بکثرت ملتے ہیں، پھر دکنی دور کے میلاد نامے ہماری شاعری میں مذہبی روایت کی تقویت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

پھر ولی دکنی دکن کے اس شعری سرمائے کو لے کر شمالی ہند پہنچتے ہیں۔ولی نے مختلف شعرا کی معنوی شاعری کے ساتھ علما کرام سے عملی طور پر بھی روحانی و مذہبی اور اخلاقی فیض و برکات حاصل کیں کیونکہ یہی اس دور کا چلن تھا اس لیے ان کی شاعری کے پیشِ نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مذہب کا رجحان ان کی شاعری میں غالب حیثیت سے نہ سہی اہم ضرور تھا۔

اے ولی جب نظر میں وہ آیا نقش سب ما سوا ہو گئے تک
عشق کرانے دل سدا تجرید کی عاشقی ہے ابتدا توحید کی

امیر خسرو اپنی پہیلیوں کہہ مکرنیوں،ان ملیوں کی وجہ سے ہندی شاعری میں مثالی اہمیت کے حامل شاعر اور صوفی تھے۔انہوں نے روحانی حقائق کو شعری پیکر میں ڈھالا۔خسرو کے قصائد میں بھی روحانی عناصر موجود ہیں وہ وحدت الوجود کے نظریے کے قائل تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں روحانیت کا عنصر غالب ہے۔خسرو کی انفرادیت بھی اسی میں ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے تضادات اور معاشرے میں روحانی کشمکش کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔امیر خسرو کے عہد میں گرونانگ اور کبیر داس نے شاعری میں روحانیت کی بات کی جس کی باقاعدہ ابتدا خسرو نے کی تھی۔

گویا اردو شاعری کے ارتقاکے ابتدائی دور میں مذہبی رنگ نمایاں تھا۔ولی اپنے عہد کے دینی اور دنیاوی علوم سے آگاہی رکھتا تھا۔اس عہد میں تصوف فکری و اخلاقی بلندی کا معیار سمجھا جاتا تھا۔ولی کے بعد تیرھویں صدی ہجری یعنی میر درد اور میر وسودا کے دور تک مذہب اور اخلاق،شعر و ادب میں ہندو و مسلم دونوں قوموں میں بڑی وسعت کے ساتھ رائج رہا۔بعد ازاں شاعری صوفیا کے حجروں اور خانقاہوں سے نکل کر سلاطین کے دوباروں اور محلوں کی زینت بنی جس کی وجہ سے اردو شاعری کے مذہبی عناصر میں کمی آئی اور دنیاداری جیسے عوامل میں اضافہ ہوا۔اس زمانے کا اہم موضوع عشق قرار دیا جاتا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ ولی نے جہاں دنیاداری کے معاملات کو اپنی شاعری میں برتا وہاں حسن و عشق کے معاملات میں سوزوگداز سے بھی کام لیا۔

پھر ان کے بعد سراج اورنگ آبادی ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری میں خود سپردگی ہے۔ان کے جذبہ عشق میں معرفت اور عرفان ذات کا پہلو اہمیت کا حامل ہے۔

راہِ خدا پرستی اول ہے خود پرستی
ہستی میں نیتی ہے اور نیتی میں ہستی
شرابِ معرفت پی کر جو کوئی مجذوب ہوتا ہے
درودیوارِ سکون مظہر محبوب ہوتا ہے

دہلی کی مغلیہ تہذیب نے ہندوستان کو متاثر کیا۔ جب یہ تہذیب زوال کا شکار ہوئی تو عہد زوال میں بے پناہ خرابیاں پیدا ہوئیں اور یہ کہا جاتا ہے۔ کہ شاعری بھی اپنے عہد کے طرز کی آئینہ دار ہوتی ہے لہذا ان خرابیوں کے دور میں تصوف کی مدد سے اخلاقی اصلاح کی کاوش کی گئی۔ جس سے عبرت، قناعت، استغفار، خوف خدا، بے ثباتی، فنا اور تزکیہ نفس جیسے موضوعات شاعری میں در آئے۔

شاہ حاتم کا شمار بھی اس عہد کے صوفی منش شعرا میں ہونے لگا۔ یہ آخری ایام میں دنیا سے کنارہ کش ہو گئے۔ شاکر ناجی کے ہاں بھی صنائع اور اخلاقی زوایے ملتے ہیں۔

ان بتوں کو ہم فقیروں سے کہو کیا کام ہے

یہ تو طالب زر کے ہیں اور یاں خدا کا نام ہے

مصطفی خان یک رنگ کے ہاں بھی پند و نصیحت اور روحانی گفتگو کا انداز ملتا ہے آبرو کے ہاں عجز و انکسار کے مضامین ملتے ہیں۔ ان کا انداز بھی فقیرانہ ہے ان کے اشعار میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے۔

شور ہے اس کی اشک بازی کا

آبرو چشم تر قیامت ہے

آبرو کے ہم عصر شرف الدین مضمون کے ہاں بھی مذہبی و اخلاقی موضوعات مل جاتے ہیں۔

ہم نے کیا کیا نہ کیا ترے غم میں اے محبوب

صبر ایوب کیا گر یہ یعقوب کیا

پھر شمالی ہند کی شاعری کے زریں دور کا ممتاز شاعر میر تقی میر جو ایک صاحب ادارک اور صاحب نظر شاعر مانے جاتے ہیں۔ میر بھی روحانی روایتوں کے وارث کہے جاتے ہیں۔ میر نے صوفیا کی صحبتوں سے فیض حاصل کیا۔ میر کا دور اور حالات ستم ظریفی کا شکار تھے۔ اس لیے ان کی شاعری میں صوفیانہ رنگ، بے ثباتی دنیا، فنا و بقا اور صوفیانہ حقائق معارف جیسے موضوعات ملتے ہیں۔

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا
ہیر عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

میر کے ہاں مذہبی، روحانی اور اخلاقی موضوعات کی کثرت ہے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں داخلیت پسند شاعر تھے اور بے ثباتی دنیا پر یقین رکھتے تھے۔

گئی آخر جلا کر گل کے ہاتھوں آشیاں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشان اپنا

اس عہد میں میر درد ایسے شاعر ہیں جن کے ہاں تصوف اور روحانیت کے عناصر سب شعرا کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ درد کا زمانہ حوادث کا زمانہ تھا اس عہد میں درد نے ضبط واستقلال کی میراث پائی۔ درد کے ہاں عام اشعار میں بھی صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ درد کی شاعری میں مقصود و مطلوب عشق حقیقی تک رسائی کی کاوش نمایاں ہے۔ ان کے ہاں سوز و گداز اور لطف کی چاشنی بھی ہے۔ جو عموماً مذہبی طرز کی شاعری میں نہیں ہوتا۔ درد نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں نظریات کو ملا کر ایک نئی وحدت دین کی سعی کی ہے جو قابل تحسین فکری اضافہ ہے۔ درد صوفیانہ شاعری کو عبادت کا درجہ دیتے تھے۔

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرح آئے تھے کیدھر چلے

سودا کو اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی زوال کا احساس شدید تھا باوجود اس کے کہ سودا ایک یمہءدول گھرانے سے تھے لہٰذا سودا نے روحانی شاعری کو محض فلسفے کی حد تک تسلیم کیا اور برتا۔

سودا نگاہ دیدہ تحقیق کے حضور
جلوہ ہر اک ذرہ ہے آفتاب کا

سودا کی رباعیوں میں مذہبی رواداری دنیا کی بے ثباتی، صبر و قناعت جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ایک رباعی میں خدا کا شکر بجالاتے ہیں۔

کتنوں کا جہاں میں زرومال ہے شکر
کتنوں کا بلند دولت و اقبال ہے شکر
یوں شکر تو سب کرتے ہیں لیکن سودا
شاکر ہے وہی جس کو بہر حال ہے شکر

سودا کے قصائد میں بھی روحانیت کے عناصر ملتے ہیں۔ان کے قصیدوں کے مدوحین اس درجے کے تھے کہ جن کی شان میں قصیدے کہے جائیں۔سودا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بھی قصیدے کہے اہل بیت کی مدح میں بھی قصیدے کہے۔

جہاں تک مرثیہ گوئی کا تعلق ہے تو مرثیہ کی روایت لکھنو میں مستحکم ہوئی اس ضمن میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بیان کرتے ہیں۔

> مرثیہ گوئی کو طور پر خاص طور پر لکھنو میں ایسی ترقی نصیب ہوئی کہ اس نے شعرائے لکھنو کی خامیوں کی بڑی حد تک پردہ پوشی کرلی۔مرثیہ اگرچہ فارسی میں اور اس کے بعد اردو میں، دکن میں اور بعد ازاں دہلی میں ترقی کی منازل طے کر چکا تھا لیکن اس فن کو حقیقی ترقی لکھنو میں نصیب ہوئی لکھنو کے مرثیہ گو شعرا ضمیر، دلگیر، خلیق، انیس، دبیر اور پھر ان کے شاگردوں اور جانشینوں نے مرثیے کو کمال معراج پر پہنچادیا۔[۱]

مسعود حسن رضوی، روح ادب میں بیان کرتے ہیں:

> اخلاقی شاعری کے اعتبار سے انیس کے مرثیوں کا پایہ بلند ہے جن میں اخلاق فاضلہ کی تعلیم انیس کے مرثیوں سے ہوتی ہے وہ اخلاق ونصائح کی کسی کتاب یا پندونصائح کے ذریعے ممکن نہیں۔[۲]

میر انیس کا نام مرثیہ گوئی کی روایت کو مستحکم کرنے کا ضامن ہے۔میر انیس نے اپنے مرثیوں کے ذریعے اخلاقی و روحانی قدروں کا پرچار کیا انہوں نے تصوف، اخلاق اور روحانیت کا درس دیا۔انیس کے مرثیوں میں طلوعِ صبح کا منظر گویا حمد باری تعالیٰ کی ہی صورت ہے۔

پھاڑا جو گریبان شب آفت کی سحر نے

پردے میں چھپایا رخ روشن کو قمر نے

پیمانہ خورشید لگا نور سے بھرنے

گردوں سے سفر فوجِ کواکب لگی کرنے

غالب ایک فلسفی شاعر تھے ان کی سوچ کا زاویہ بہت بلند تھا۔عشق و محبت کے حوالے سے غالب نے جن روحانی خیالات کو بیان کیا ہے۔وہ دنیاوی نقطہ نگاہ سے الگ ہیں۔ان کے ہاں عشق ایک پاکیزہ جذبہ ہے جو کائنات میں روح کی طرح جاری ہے غالب وحدت الوجود کے نظریے کے قائل تھے ان کے کلام میں بھی روحانیت جلوہ گر ہے۔

اقبال کا تمام تر کلام قرآن و سنت سے ماخوذ ہے۔اقبال کا فلسفہ دراصل خودی کا فلسفہ ہے۔خودی اقبال کی فکر کا نقطہ آغاز بھی ہے اور بنیادی نقطہ بھی۔خودی ہی انہیں روحانیت کے درجے پر فائز کرتی ہے۔اقبال نے اسلامی فکر اور تمدن کا گہرا مطالعہ کیا اور مسلمان کے زوال کا سبب نفی خودی بتایا۔اقبال کے نزدیک خودی کا صحیح احساس معرفتِ الٰہی کا ذریعہ ہے اور دنیا کی کامیابی کا ضامن بھی۔

جدید شعرا کے ہاں بھی خواہ وہ حلقہ ارباب ذوق کے زیر اثر ہوں یا ترقی پسند تحریک سے وابستہ مذہبی رنگ کسی نہ کسی صورت میں ضرور نمایاں ہوا۔

جدید شعرا نے وجودیت اور نفسیات کے زیر اثر داخلیت کو وسیع تر معنی دینے کی سعی کی اور روحانی و اخلاقی اقدار پر زور دیا اور یہ سلسلہ جاری ہے جب تک انسانی جذبے اور اخلاقی اقدار زندہ ہیں۔شاعری کی ترجمات میں عقیدت کے یہ زاویے موجود رہیں گے۔

ب) بشیر صرفی کے کلام میں عقیدت کے زاویے:

عام طور پر عقیدت کے تین بنیادی زوایے شمار کیے جاتے ہیں۔ حمد، نعت اور منقبت خدا رسول اور بزرگان دین سے محبت وعقیدت مسلمانوں کے ایمان کا حصہ ہے۔ شاعر اپنی شاعری میں ان اصناف کی بدولت عقیدت و محبت کے جذبات کا اظہار کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ عربی فارسی اور اردو شاعری کا شاید ہی کوئی مسلمان شاعر ایسا ہو کہ جس کے کلام میں عقیدت کے یہ تین زاویے موجود نہ ہوں۔

بشیر صرفی کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا۔ آباؤ اجداد کا تعلق کشمیر کے ساتھ ساتھ ایران سے بھی تھا۔ والد اور دادا سے عربی فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی لہذا کچھ روایت کے تناظر میں اور کچھ مذہبی پس منظر کی بنا پر عقیدت و محبت کے عناصر بشیر صرفی کی شاعری میں رچ بس گئے تھے۔ وہ ایک باعقیدہ سنی مسلمان تھے ان کے کلام میں حمد کے ساتھ ساتھ نعتِ رسولِ مقبول اور منقبت کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے جو ان کی شخصیت کے مذہبی پہلو کی نشاندہی کرتا ہے۔ موضوع زیر بحث میں بشیر صرفی کی شاعری میں عقیدت کے انہی زاویوں حمد، نعت اور منقبت کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔

i۔ حمد گوئی:

حمد مدح سے نکلا ہے اور عربی زبان کا لفظ ہے حمد سے مراد تعریف بیان کرنا ہے اصطلاحاً حمد کا لفظ اپنے مخصوص معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی حمد اللہ پاک کی تعریف و توصیف بیان کرنا ہے۔ خدا کا تصور بنیادی طور پر دنیا کے ہر مذہب میں کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے اور ہر مذہب میں اپنے رب کی بندگی اور عبادت کے اپنے مخصوص طور طریقے رائج رہے ہیں اور بحیثیت مسلمان ہم اپنے رب کی بندگی اور اس کا شکر مختلف انداز سے بجالاتے ہیں ایک عام انسان قرآن و سنت کے احکامات کی روشنی میں اپنے رب کے آگے سر بسجود ہوتا ہے۔ شاعر اپنی شاعری کے ذریعے اس ذات پاک سے اپنی عقیدت و بندگی کا اظہار اپنے مخصوص انداز میں کرتا ہے اور اس ذات بابرکت کی بے حد و حساب نعمتوں اور رحمتوں کے صلے میں اپنی کم مائیگی کا

اعتراف کر تا ہوا نظر آتا ہے۔ بحیثیت مسلمان ہماری یہ روایت ہے کہ ہم اپنے ہر اچھے کام کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے کرتے ہیں اس کے بعد وجہ تخلیق کائنات یعنی احمد مصطفیٰ کی تعریف بیان کرتے ہیں۔

بشیر صرفی کے کلام کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس کا غالب حصہ حمد اور نعت و منقبت کا ہے اردو میں مذہبی شاعری کی ابتدا اردو کے اولین صاحبِ دیوان شاعر قلی قطب شاہ سے ہو گئی تھی۔ بشیر صرفی کی شاعری میں ایک حمد اڑ تیس نعتیں، دو ترجمہ کی گئی نعتیں، پانچ منقبت اور ایک قصیدہ بحضور زندہ پیر صاحب موجود ہیں۔ کلام معلق میں بھی ایک حمد اور ایک نعت شامل ہے۔ یوں دیکھا جائے تو کلام بشیر صرفی کا معتد بہ حصہ شاعری پر مشتمل ہے

بشیر صرفی کی نعت گوئی کے حوالے سے ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

> نعت گوئی کا فن انھیں وراثت میں ملا اپنے دادا ملا محی الدین کاشمیری اور والد خواجہ عبدالاحد دلاور وانی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بشیر صرفی نے نعت گوئی اختیار کی۔ بزرگان کا مدتوں سینچا سلیقہ بشیر صرفی کے لاشعور میں موجود تھا یہی وجہ ہے کہ جب جب نعت کے لئے ان کا قلم چلا ہے عقیدتوں کے پھول جڑے ہیں۔[۳]

بشیر صرفی کے دادا اور والد فارسی زبان کے بہت اچھے شاعر تھے بشیر صرفی کو عربی زبان میں عبور حاصل تھا لہذا ان کے مجموعہ کلام میں شامل حمد فارسی زبان میں ہے اور عشق الٰہی سے سرشار ہو کر لکھی گئی صفات الٰہی سے مزین یہ حمد سلیس مگر بلیغ فارسی زبان میں لکھی گئی۔ بشیر صرفی فارسی الفاظ و تراکیب کو مہارت سے برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ حمد یہ شاعری میں عقیدت، معرفت، بندگی، عظمتِ خداوندی، اپنی ذات کی نفی اور جگہ جگہ ذات باری تعالیٰ کے سامنے اپنی کم مائیگی کا اظہار ملتا ہے۔ بشیر صرفی بڑی وارفتگی کے ساتھ اللہ کی صفات گنواتے ہیں۔ اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں:

اے خدائے ذوالکرام و ذوالجلال
اے بلند از ہر گمان و ہر خیال
اے توی صورت گر ہر خوب و زشت

اے بہ حرف کنُ کنی پید ا جہاں
تو نہ سازی ہیچ چیزے رائیگاں

"کلام بشیر صرفی" ص ۱۳

عموماً حمد و نعت میں یہ مسئلہ درپیش ہو تا ہے کہ وہ مناجات کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور شاعر کی توجہ اپنے مسائل و مصائب کی طرف نگاہِ کرم کی التجا پر مرکوز رہتی ہے لیکن بشیر صرفی کی حمد ذات باری تعالیٰ کی صفات کا بیان اور رب کائنات کی مدح ہے اور یہی مدح شاید بہترین دُعا ہے۔یعنی ذاتِ باری تعالیٰ کی صفات کا اعتراف کرنا۔

اس کے علاوہ بشیر صرفی کے کلام میں دعائے فجر کے نام سے ایک طویل حمد ہے جس میں اللہ کی تعریف اور اس کی نعمتوں کو گنوایا گیا ہے۔

ایک حرفِ کُن سے پیدا کر دیا
اے خدائے لا یموت و لا یزال
ہے فنا ہے شے کو اور تجھ کو بقا
تو ہے قادر اور ہر شے پر محیط

ص ۴۴

شاعر اللہ کی صفات کو بیان کرتا ہے کہ تو یومِ جزا و سزا کا مالک ہے تیرا نور ذرے ذرے میں ہے۔اس کائنات کو تو نے ہی تخلیق کیا ہے۔یہ دن رات کا ادل بدل اور اس دنیا کی کوئی چیز بھی نکمی نہیں تیری نعمتیں اور رحمتیں بے حد و حساب ہیں کہ تو نے انسان کو تخلیق کر کے اس کو نیابت کے مرتبے پر فائز کیا اور عقل عطا کی شاعر اس قدر اعزاز و اکرام پر اللہ کا شکر گزار ہے پھر احساس ندامت ہے۔شاعر یوں بیان کرتے ہیں:

میں تیرا عبدِ ذلیل و روسیا
بندہِ عاصی، اسیر صد ہوا

بھول بیٹھا آدمیت کا مقام
سچ تو یہ ہے کہ خود کو رسوا کر دیا
پر تیری شان کریمی کے نثار
اے خدا تو نے میرا پردہ کیا

ص۴۶۔۴۵

پھر شاعر اپنی بندگی کا اظہار کرتا ہے کہ میں جیسا بھی ہوں تیرا بندا ہوں تو ہی مجھے توبہ کی توفیق دے اور مجھے اپنے نفس کے فریب سے بچالے اور اپنی معرفت عطا کر اور مجھے حسنِ عمل کی راہ پر ڈال دے پھر آخر میں خدا سے دعا ہے کہ فقر و فاقے سے بچا اور صحت جان کے ساتھ صحت ایمان بھی عطا کر آخر میں دعا کی قبولیت کے طلبگار ہیں۔

ان دعاؤں پر ہوا بابِ قبول
ہوں قبول حق بہ حق مصطفا

ص۴۶

بشیر صرفی نے اپنی حمد یہ شاعری میں ایک حمد ابتدا میں بیان ہے اور دوسری کلامِ معلق کی شاعری میں انھوں نے حرمت لفظ اور حمد کے اوصاف کو بخوبی نبھایا ہے یہ عقیدہ ایک سچے مسلمان کی طرح پوری عقیدت کے ساتھ بشیر صرفی کی نعتوں میں جلوہ گر ہے:

سچ یہ ہے کہ ہر شے ہے اسی نام کے صدقے
اللہ نے رحمت کو اسی اسم میں ڈھالا

ص۴۲

کلام معلق میں سب سے پہلے حمد اور پھر نعت کے عنوان سے حمد اور نعت شامل ہیں۔بشیر صرفی نے نعت اور حمد لکھ کر خود کو اللہ اور اس کے رسول سے جوڑا ہے وہ اپنی حمد میں اپنی آرزوں اور خواہشوں کے لیے

اپنے مالک حقیقی کے آگے التجا کرتے نظر آتے ہیں اور اپنے زور کلام میں مزید بہتری کے خواہاں نظر آتے ہیں۔

وہ رنگ دے مجھے کہ ہو اوروں سے مختلف
مرے حروف میں ملا دل کا مرے لہو

اور اس کے ساتھ ہی وہ رحمت الا لعالمین سے روز محشر شفاعت کے طلب گار بھی دکھائی دیتے ہیں۔

نعت کے واسطے ہے جو رحمت کی انتہا
باب سخا وجو د و کرم، شاہ دوسرا

ii۔ نعت گوئی:

عربی زبان کا لفظ "نعت" جس کے معنی تعریف و توصیف کے ہیں لیکن اصطلاح میں " نعت" کا لفظ اپنے مخصوص معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے مراد نبی کریم ﷺ کی تعریف اور مدح بیان کرنا ہے۔ اردو نعت میں نعت کا معنی اصطلاحی حوالے سے ہی درج کیا گیا ہے۔

مرزا مقبول بد خشانی تحریر کرتے ہیں وہ نظم جو رسول اکرم ﷺ کی شان میں کہی جائے۔ علیم صبا نویدی "یب" کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

> اصطلاح شاعری میں حضوراکرم ﷺ سرور کائنات کی مدح سرائی یا آپ کے اوصاف حمیدہ کو بصد خلوص وعقیدت نذرانہ پیش کرنے کا نام نعت ہے۔[۴]

ڈاکٹر نیاز فتح پوری کے خیال کے مطابق نعت حضور ﷺ کی ایسی ثنائی ہے جس میں حضور ﷺ کی صفات کا ذکر خیر کیا جائے۔ اگر شاعر اپنی ذاتی تکالیف کا حوالہ دے کر حضور پاک ﷺ کی بارگاہ میں التفات پیش کرے تو وہ نعت نہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کعب بن زہیر نے قصیدہ "بانت سعاد" میں اپنی زبوں حالی کا نقشہ کھینچ کر حضور پاک ﷺ کی ذات وصفات کے نقوش کو روشن کیا اور نبی پاک ﷺ نے اپنی چادر مبارک اس کو عطا کی۔

عہد نبوی کے نعت گو شعر احسان بن ثابت، کعب ابن زبیر، حضرت علی اور حضرت بی بی فاطمہ نے بھی نعتوں میں اپنی حالت زار کو بیان کر کے حضور ﷺ سے استقامت کی دعا کی ہے۔ قصیدہ بردہ شریف "شیخ محمد البوصیری" اسی روایت کا تسلسل ہے یہ سلسلہ نعتوں میں بھی شروع ہو گیا کہ شاعر اپنی بے کسی و پریشان حالی کا اظہار کر کے حضور سرورِ کونین کی ذاتِ تقدس میں عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کرتے رہے دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے سب سے پہلا نعت گو خود ذات باری تعالیٰ ہے جس نے اپنے کلام میں نبی کریم کی تعریف کی یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو شاعری کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا لیکن یقیناً اللہ کا کلام ایک اعلیٰ فصاحت و بلاغت کا حامل ہے۔

رسول عربی ﷺ سے محبت و عقیدت کے اظہار نے مسلمانوں کے شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کیا ہے مسلمان کے فنونِ لطیفہ خصوصاً شعر و ادب پر اس والہانہ محبت و عقیدت کے اثرات بڑے گہرے مرتب ہوئے اسی اثر کی وجہ سے نعت گوئی مسلمان شعرا کے فکر و فن کا مستقبل جزو بن گئی ہے۔ فارسی، عربی اور اردو کا شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو۔ جس نے رسول پاک ﷺ سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار اور انسانی زندگی پر ان کے بے پناہ احسانات کا تذکرہ " نعت " کی شکل میں نہ کیا ہو۔ اردو ادب نعتوں کے بے پناہ ذخیرے سے مزین ہے کیونکہ اردو شاعری میں فارسی کے زیر اثر مذہبی روایات و اقدار کا ذخیرہ موجود ہے۔ "نعت" کا لفظ جب استعمال کیا جاتا ہے تو اس کو موضوع یا مضمون کے طور پر لیا جاتا ہے اس سے مراد وہ ذخیرہ ہوتا ہے جو حضور اکرمؐ کے فضائل و شمائل اور مناقب پر مشتمل ہوتا ہے۔ نظم و نثر دونوں صورتوں میں توصیف نبیؐ کو ہی نعت کہا گیا ہے۔

جناب رفیع الدین اشفاق، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> اصولاً آنحضورؐ کی مدح سے متعلق نظم و نثر کے ہر ٹکڑے کو نعت کہا جائے گا لیکن اردو اور فارسی میں جب نعت کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے عام طور پر آنحضورؐ کی منظوم مدح کی جاتی ہے۔[۵]

نعت کی کوئی تکنیک یا ہیت نہیں۔ لفظ نعت شاعری کی ہیت کے بجائے موضوع کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اگر بظاہر دیکھا جائے تو نعت کا موضوع بہت محدود نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً یہ موضوع انتہائی عظیم اور وسعت کا حامل ہے۔ عظیم اس لیے کہ اس کائنات کی انتہائی معتبر ہستی جسے رحمت اللعالمین کہا گیا یعنی یہ کسی خاص گروہ، قوم یا ملت کے لیے نہیں بلکہ سارے جہان کے لیے باعثِ رحمت ہے۔ موضوع کی وسعت اس حوالے سے ہے کہ آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں بنی نوع انسان کے تمام پہلوؤں میں جن میں سیاسی، سماجی، تہذیبی و ثقافتی اور نجی مسائل کا حل موجود ہے۔

علاوہ ازیں ہمارے شعرا نے نبی پاک ﷺ کے معجزات، حلیہ اقدس اور واقعہ معراج کو بھی اپنی نعتوں کا موضوع بنایا ہے۔ نعت کا دائرہ بڑی وسعت کا حامل ہے اس میں حضور اکرم ﷺ کے معاملات زندگی، عبادات و غزوات، فضائل و شمائل، حسن بیان و معاملہ، آداب مجالس پیغامات اور اخلاق نبوی ﷺ کے بے شمار پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ حضور اکرمؐ کا عدل و انصاف، ان کی سخاوت ان کا ایثار، حسن سلوک حسن معاملہ و بیان، شفقت و محبت، عیادت و تعزیت، زہد و تقوی، ایفائے عہد، عزم و استقلال، شجاعت، صداقت، دیانت، مساوات مہمان نوازی، عفوو در گز، رقیق القلبی، رحمت، الغرض تمدنی و سماجی زندگی کا کوئی رخ، کوئی پہلو ایسا نہیں کہ جو نعت کے اندر نہ سمویا جاسکے۔ دنیا میں آج عظمت انسانی کے جتنے بھی خصائص گنوائے گئے ہیں۔ وہ تمام حضور اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے سامنے حقیر چیزوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو نعت کو با قاعدہ صنف کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ آج اردو نعت گوئی فنی و فکری سطح پر ایسی بلندی پر ہے کہ نعت رسول مقبول کا جو اثاثہ اردو میں موجود ہے دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں۔ عصر حاضر میں بشیر صرفی، امین راحت چغتائی، اجمل نیازی اور صلاح الدین پرویز نے نظم کی صورت میں خوبصورت نعتیں کہیں۔ ان کے علاوہ صہبا اختر، ریاض حیدر، امین نقوی، عزیز حاصل پوری، اصغر حسین خان، نظر لدھیانوی، ذوقی، مظفر، علیم ناصری، سید عاصم گیلانی اور بے شمار شعرا نے حضور اکرمؐ سے اپنی والہانہ عقیدت و محبت کا اظہار کیا۔ آج نعت کی صنف میں ندرت خیال و وسعت و تنوع مقدار و معیار کے لحاظ سے قابل فخر سرمایہ موجود ہے۔ بشیر

مرضی کے کلام میں اڑتیس کے قریب نعتیں شامل ہیں۔ ایک سچے مسلمان کی طرح عقیدت و محبت کا جذبہ پورے طور پر ان کی نعتوں میں جلوہ گر ہیں۔

بشیر صرفی عشقِ الٰہی میں ڈوب کر اور ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی طرح لولاک کے عقیدے کو دوہراتے چلے جاتے ہیں:

خدا کے نام کا پر تو ہے احمد مرسل
کہ بزمِ زیست میں اس نام سے سحر آئے
ہو اس کا ذکر تو اور کا کہاں مذکور
وہ آنکھ میں ہو تو پھر اور کیا نظر آئے

ص۶۱

پھر لکھتے ہیں:

تو نورِ ازل ہے تو کراں تا بہ کراں ہے
کیا دیکھے گا تجھ کو کوئی ظاہر کی نظر سے

ص۶۹

درودِ پاک کی فضیلت نعتیہ کلام کے مستقل موضوعات میں سے ہے درودِ پاک در حقیقت عربی میں لکھی ہوئی نعت ہے اور تمام تر نعتیہ کلام، درود سلام صفاتِ محبوب خدا کے بیان کے علاوہ ان کے پڑھنے کا اجر بہت ہے کلامِ بشیر میں بھی درودِ پاک اور ذکرِ نبی کی فضلیت اور برکات کا تذکرہ جا بجا ملتا ہے وہ لکھتے ہیں:

مشام جان میں ہے خو شبو درود کا پڑھنا
علیہ صلو و آل محمد عربی

ص۳۳

درود کی ایک اور شکل یہ بھی ہے کہ عرشِ بریں پر فرشتے حمدِ باری تعالیٰ کے ساتھ ساتھ درود پاک پڑھنے میں بھی مصروف ہیں۔ قرآن نے ورفعنا لک ذکرک کہہ کر درود پاک کی فضیلت کی مہر ثبت کر دی ہے۔

ہے عالم خاکی کو اسی اسم سے تزئین
یہ نام سر عرشِ بریں بھی ہے دو بالا
دائم ہے فرشتوں کی زبان پر بھی یہی نام
اونچا ہے بہت ذکر تیرا لولوئے لالا

ص ۴۲

عاشقِ رسول بھی ہو اور شاعر بھی اور شعر کہنے کے سلیقے سے آشنا بھی اور ذکرِ محبوب سے کلامِ عشق کی زینت کے اسرار سے بھی آگاہ ہو تو پھر نعت کے ایسے شاہکار نمونے وجود میں آتے ہیں جن میں ذکرِ حبیب کو سرور و تکریم کا باعث قرار دیا گیا ہو۔

تیری مدح مجھ کو سرور جاں تیرا ذکر میرا کمالِ فن
تو ہے عنایتِ دل عاشقاں تو ہے سرورِ سہ ہہ دوسرا

ص ۴۸

درودِ پاک ہر مشکل کے لیے کلید ہے:

درودِ صلِ علیٰ کا اگر سہارا ہو
تو کارگاہ جہاں میں نہ کچھ محال رہے
یہ تیرا کرم ہے کہ مجھ روسیہ کو
ثنا خوانِ شاہِ امم کر دیا

ص ۶۵

چنانچہ وہ اعلان کرتے ہیں:

نہ ختم ہوں گی ابد تک یہ سوغاتیں
درود آئے صلوۃ آئے سلام آئے

ص۷۰

میری زبان پر نعت ہے کرم تیرا
تیرے ہی لُطف سے الفاظ میں اتر آئے

ص۶۱

عاشقانِ رسول کے لیے جو عزت و تکریم ذاتِ رسول کے لیے ہے ایسی ہی محبت و تکریم ان کے اندر رسول کریم سے نسبت کی حامل ہر چیز خصوصاً مدینہ شریف کے لیے بھی ہے مدینہ وہ شہر محبت ہے جہاں ہجرت کے بعد اللہ کے نبی نے نہ صرف مواخات کا رشتہ قائم کیا بلکہ صحیح اسلامی معاشرہ قائم کر کے رول ماڈل کی حیثیت دی۔ مدینہ کی گلی کوچوں سے عقیدت و محبت ہر مومن کے دل میں موجزن ہوتی ہے اور شاعر کے دل میں مدینہ کی گلیوں سے محبت اور تڑپ موجود نہ ہو ممکن ہی نہیں۔ بشیر صرفی کے ہاں بھی مدینہ کے گلی کوچوں سے ان کی والہانہ محبت جابجا جھلکتی ہے۔

آنکھوں کو نہیں طاقتِ دیدارِ مدینہ
پر دل میرے نقش ہیں آثارِ مدینہ
وہ موت ہو یا زیست ہو یا حشر کا میدان
رحمت تیری ہر آن ہے سرکارِ مدینہ
اس ارض و سماں میں ہی نہیں اس سے سوا بھی
رحمت کی ہر اِک شاخ ہے ثمر بار مدینہ

ص۳۸

مدینہ تو مدینہ اس شہر بے مثال سے جن کو حاضری کا بلاوا آتا ہے وہ بشیر صرفی کے نزدیک لائق محبت و تکریم ہیں چنانچہ بشیر صرفی کے ہاں اس در سے عقیدت و محبت کا یہ عالم ہے کہ وہ خود کو ان لوگوں کے قدموں میں بچھا دینا چاہتے ہیں:

آسماں سے یہی فزوں کیسے زدمیں ہوتی ہے

اس خنک شہر میں ایک بارجا کر تو دیکھیں

جنھیں اس شہر محبت سے بلاوا آئے

ان کے قدموں میں خود کو بچھا کر دیکھیں

بشیر صرفی کے نزدیک اس شہر کی خاک بھی اتنی مقدس ہے کہ آسمان بھی اس پر رشک کرتا ہے:

کیا کہنا تیری شان کے اے ارضِ مدینہ

قربان ہے تیری شان پر ہر ارضِ بالا

ص ۴۲

بشیر صرفی، نبی پاک کے عشق میں ڈوب کر نعت کہتے ہیں ان کے اندر اس در کی طلب اور تڑپ موجزن ہے۔ اور یہی تڑپ ہر عاشقِ رسول کی زندگی کا مرکز و محور ہے۔ مدینہ ان کی دعاؤں کا مستقل حصہ ہے۔

بسے مدینہ نگاہوں میں اس طرح میرے

نظر سے جلوہِ طیبہ نہ دور ہو جائے

ص ۵۶

مدینہ جو کوئے نبی ہے اس شہر سے بے فیض و نامراد کبھی کوئی لوٹا ہے اور نہ ہی لوٹ سکتا ہے۔

وفورِ شوق سے میں سر کے بل چلا جاوں

میرے نصیب میں گر طیبہ کا سفر آئے

طوافِ کوئے محمد نصیب ہو جس کو
کبھی ہوا ہی نہیں کہ بے ثمر آئے

ص ۶۱

بشیر صرفی بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں ان کی نعتیں زیادہ تر غزل کی ہیت میں ہیں بعض اشعار ایسے ہیں جو غزل کے اشعار معلوم ہوتے ہیں انھیں اگر نعت کے عنوان کے ذیل سے غزل میں رکھ دیں تو دگنا لطف دیں کیونکہ ان سے کسی شعر کے حقیقی معنی لیے جاسکتے ہیں اور مجازی بھی لیکن جن اشعار میں محبت کا اظہار ذاتِ نبی سے اس طرح کیا جائے کہ مقامِ مصطفیٰ کی حُرمت و تکریم بھی برقرار رہے اور شعر میں تغزل بھی اس طرح شامل ہو کہ اسے کسی بھی دنیاوی محبوب سے منسوب کیا جا سکے یقیناً شاعر کا کمال ہے۔ بشیر صرفی کے ہاں اس کی متعدد مثالیں مل جاتی ہیں جہاں جذبے کی عمومیت اسے کسی بھی محبوب سے محبت کا اظہار بنا دیتی ہے لیکن عقیدت کا جذبہ بھی اسی قدر موجود ہے۔ ایسے اشعار کی چند مثالیں بشیر صرفی کے کلام سے پیش کی جاتی ہیں۔

نہ خوف حزن نہ ہی دل میں کچھ ملال ہے
تیرا کرم ہو تو کیسے دل میں بال رہے

ص ۵۵

کچھ متاعِ زیست اب جز دیدۂ پرنم نہیں
ہو مگر تیرا سہارا تو کوئی غم غم نہیں

ص ۶۶

اک تیری محبت نے سحر تاب کیا ہے
تاثیر نہیں لفظ میں کچھ میرے ہنر سے

ص ۶۹

پھر اپنے ذکر کی لذت سے آشنا کر دے
حریمِ جاں سے مرے دور بے کلی کر دے

ص۷۹

ادائے حسن ہے وجہ قرار اس کے لیے
جسے تو واقفِ اسرارِ عاشقی کر دے

ص۲۸۱

بشیر صرفی کے نعتیہ کلام کے حوالے سے ڈاکٹر شفیق انجم یوں بیان کرتے ہیں:

نگاہِ لطف و کرم کا طلبگار اور شانِ و مقامِ مصطفے کے لیے مر مٹنے والے بشیر صرفی کے اظہار عشق میں بلا کی تڑپ، خلوص اور والہانہ پن ہے عشق کا جوبن فنی کمال کے ساتھ مل کر ان کی نعتوں میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا کیے ہوئے ہے ایسی کیفیت جو دل کی گہرائیوں کو چھوتی اور تاثر کے نقش کو جاوداں بناتی ہے۔[۶]

بشیر صرفی کی نعتیں عشق کے جذبے سے سرشار اور آقا کی عظمت کا نقش لیے ہوئے ہیں شاعر بارگاہِ نبوی میں سراپا عجز وانکسار ہے:

نگاہِ لطف جو ہم پر حضور ہو جائے
تو جاں سے کاہشِ جاں کیوں نہ دور ہو جائے
تیرا دیار ہو، میں ہوں اور اشک کی جھڑیاں
یہ اک بار تو آقا ضرور ہو جائے

ص۵۶

کچھ متاعِ زیست اب جز دیدہ پرنم نہیں
ہو مگر تیرا سہارا تو کوئی غم، غم نہیں

آپ کے در کی گدائی سے رہے نسبت مجھے
اور کچھ مجھ کو اے شہ اکرم نہیں

ص۶۶

کلام بشیر صرفی میں ایک کشمیری نعت کا ترجمہ بھی ملتا ہے جس کا موضوع بھی حضورِ پاک سے عقیدت، ان کے در پر جانے کی خواہش اور تکالیف اور مصائب میں ان کے نظرِ کرم کی خواہش، اپنے گناہوں پر ندامت، نبی پاک کے دیدار اور آپ کے قدموں پر سر رکھ دینے کی خواہش موجزن ہے۔ ایک نعتیہ قصیدہ بھی شامل ہے جس میں نبی پاک کے رُخِ انور کو مطلع انوار سے تعبیر کیا گیا ہے پھر ان کے نور والی صفت کو بیان کیا ہے اور یہ کہ اس کائنات کی ہر شے درود خواں ہے پھر آپ کو تخلیقِ کائنات کا سبب قرار دیا گیا ہے اور تمام انبیا کے اذکار کا حاصل قرار دیا گیا ہے گویا اس قصیدے میں نبی پاک کی بے پناہ صفات و برکات کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں دعائیہ کلمات بیان کیے ہیں کہ میرا سینہ کھول دے تاکہ میں تیری ثنا بیان کر سکوں اور اس خواہش کا اظہار ہے کہ میں مزید نعت کہہ سکوں۔

نعت گوئی کا منصب دراصل ایک مومن کے عقیدے کے مطابق رحمت کی ارفع ترین شکل ہے یہ منصب کسی شعری مہارت یا فنی قامت کے زور پر نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ ہوتا ہے۔ موجودہ عہد میں نعت بہت لکھی جا رہی ہے لیکن اکثر مروجہ نظام اور ضرورت کے تحت لکھی جا رہی ہیں۔ نعت کے حوالے سے بہت کم سرمایہ ایسا ہے جسے احترام اور ادب کے حوالے سے علمی معنوں میں معتبر گردانا جا سکے۔ نعت بے تحاشا ادب کی متقاضی صنفِ سخن ہے۔ یہ صنف اس لحاظ سے پل صراط کی مانند ہے کہ ایک ذرا سی قلم کی جنبش یا پس و پیش شاعر کو گناہ گار بنا سکتی ہے لہٰذا لازم ہے کہ اس دربار میں حاضری اور ثناخوانی کے وقت شاعر محتاط عاشقانِ رسول کی سرشاری بہت ضروری ہے۔ فکری اور فنی اعتبار سے بھی ارفع ہونے کی شرط نعت گوئی میں مقدم رہنی چاہیے۔ نعت میں جذبات کا وفور اور حبِ رسول کی فراوانی اسے ایک متوازن اور متناسب شایانِ شان رسول ثنا بناتی ہے۔

نعت میں جذبات کی طہارت کے علاوہ موسیقیت اور شریعت بھی ضروری ہے۔ نعتوں میں نہ صرف زمینوں اور بحور کا تنوع بلکہ مصرعے کی چستی اور ندرتِ کلام احسن خوبی ہے۔ نعت کا شاعر اپنی روحانی واردات کو اتنے سلیقے سے پیش کرتا ہے جس کا اثر ایک ایک شعر کے رگِ جاں سے چھلکتا ہے۔

نعت گوئی کا ایک حوالہ نعت خوانی بھی ہے شعرا نے نعت کے لیے مترنم بحور کا انتخاب کیا ہے تاکہ انہیں پڑھ کر ان کا حسن دوبالا کیا جاسکے بشیر صرفی کی نعتیہ منظومات میں مترنم بحروں اور رواں زمینوں کا استعمال انھیں اس روایت کا تسلسل بنا دیتا ہے جو نعت گوئی میں خاص سلیقے اور توازن کے علائم ہیں زیادہ تر نعتیں چھوٹی بحروں میں لکھی گئی ہیں طویل بحور کے انتخاب میں بھی یہ امر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ وہ کسی افراط کا شکار نہ ہوں بلکہ مناسب اور متوازن طوالت کی بحر کا انتخاب کر کے گو مدحت و ثنا کے شعری اظہار کا حق بشیر صرفی نے ادا کر دیا۔

۳۔ منقبت نگاری:

جس طرح حمد و نعت کو شاعری میں اعلیٰ ترین اصناف کا درجہ حاصل ہے اسی طرح منقبت کا درجہ بھی اصناف شاعری میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ منقبت کے لغوی معنی بھی حمد و نعت کی طرح تعریف و توصیف بیان کرنے کے ہیں۔ یہ لفظ عربی زبان کے لفظ ''نقب'' سے نکلا ہے جس کے معنی ''تلاش'' کرنا کے ہیں۔ اگر کسی برگزیدہ شخصیت کے اوصاف حمیدہ، کردار اور فضائل کو تلاش کر کے منظوم صورت میں بیان کیا جائے تو وہ منقبت کہلاتی ہے۔ نوراللغات میں منقبت کے معنی یوں بتائے گئے ہیں۔ تعریف و توصیف، صفت و ثناء اصطلاح شعرا میں اس تعریف سے مراد ہوتی ہے جو اہل بیت اور صحابہ کی شان میں ہو۔[۷]

نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ کی تعریف میں یوں بیان کرتے ہیں:

الصحابہ کا لفۂبالام ۂیھ م اقتدیتم اھدیتم

میرے صحابہ مثل تاروں کے ہیں ان میں سے جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت یاب ہوگے۔[۸]

حدیث نبویؐ سے منقبت کے شرعی جواز سے واقفیت ہوتی ہے۔

منقبت میں حسبِ مراتب کا خیال رکھا جانا بہت ضروری ہے یعنی یہ حمد و نعت کی حدود کو نہ چھونے پائے منقبت دار صل عقیدے کی طرز کی ایک نظم ہے جس میں شاعر کسی بزرگ ہستی کے لیے اپنے جذبات اور ان سے والہانہ عقیدت اور وابستگی کا اظہار کرتا ہے گویا منقبت صوفیانہ عقیدت کے اظہار کے لیے کسی بزرگ ہستی کی شان میں کی جانے والی منظوم تعریف کو کہتے ہیں منقبت کے متعلق عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ علی ابی طالب کی شان میں کہی جاتی ہے اور ان کے اہل خانہ کی تعریف پر مبنی نظم ہے۔اس ضمن میں پیر نصیر الدین "فیض نسبت" میں بیان کرتے ہیں:

> منقبت کا لفظ بالخصوص حضرت علی کی تعریف میں لکھے گئے اشعار کو کہا جاتا ہے۔البتہ صحابہ کرام آئمہ اکرام اور صوفیا کی تعریف بھی اس زمرے میں آتی ہے۔[۹]

حضرت علی کے حوالے سے ایک منقبت کی مثال ملاحظہ ہو:

عصر نو کی کربلا کے ہو گئے
ظاہراً کہہ لیجیے کہ کھو گئے
دیر تک لاتے رہیں گے برگ و بار
بیج ایسے بار آور ہوگئے
زندگی بھر کی ریاضت کے سبب
کشتِ غم خواری کا حصہ ہو گئے
ترک کی پل بھر میں ہر مصروفیت
اور انعام عشق پا کے سو گئے
سبط جعفر خون میں اپنے تیر کے
آقا و مولا سے ملحق ہو گئے[۱۰]

لیکن اصطلاح میں یہ نظم کسی صوفی بزرگ کی شان میں کہی جا سکتی ہے۔ عمومی طور پر یہ نظم صوفیا کے درباروں میں قوالیوں کی صورت میں پڑھی جانے والی نظم ہے۔منقبت دراصل قصیدے ہی کی طرز کی نظم ہے

جس میں شاعر کسی بزرگ ہستی کے لیے اپنے جذبات اور ان سے والہانہ عقیدت اور وابستگی کا اظہار کرتا ہے گویا منقبت صوفیانہ عقیدت کے اظہار کے لیے کسی بزرگ ہستی کی شان میں کی جانے والی منظوم تعریف کو کہتے ہیں۔

اردو شاعری میں تقریباً سبھی شعرا نے منقبت کہی ہے۔ کلام بشیر صرفی میں نعت کے علاوہ چند بزرگ ہستیوں کی منقبت بھی شامل ہے۔

بشیر صرفی کے کلام میں پانچ منقبت، اور ایک قصیدہ بحضور زندہ پیر گھمگول شریف کی شان میں شامل ہے۔ کلام بشیر صرفی میں پہلی منقبت بحضور سیدنا حضرت ابو بکر صدیق کی شان میں کہی گئی ہے عاشقانِ رسول کے لیے حضرت ابو بکر کی زندگی مشعلِ راہ ہے۔ آپ کو یارانِ نبوی میں سب سے اعلی مقام حاصل ہے۔ آپ کے ہاں نبی ﷺ سے عشق کی کوئی اور مثال نہیں ملتی اپنی بیٹی رسول اللہ ﷺ کی زوجیت میں دے کر دوستی کو رشتہ داری میں بدلنا ہو یا اللہ اور رسول ﷺ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا معاملہ ہو یا غارِ حرا میں اللہ کے رسول ﷺ کی ہمرکابی ہو یا واقعہ معراج کی تصدیق ہو یا رسولِ امین ﷺ کی خلافت کے معاملے میں سبقت ہو۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ عاشقانِ رسول کے لیے ہمیشہ ایک مثال بن کر سامنے آئے۔ اس عظیم خلیفہ کی شان میں منقبت لکھتے ہوئے بشیر صرفی نے ان تمام حوالوں کو مد نظر رکھا ہے:

چراغِ بزم رسالت وہ یارِ غار رسول
وہ ہر قدم پر رسالت مآب کو مقبول
وہ شرعِ و راہ طریقت کا مردِ صدر نشیں
وہ راز دان راہِ راست راہِ دینِ متین
جمالِ یار کا پر ُ یِ توکمال عشقِ نبی
جہان و عقبیٰ میں بس ساتھ ساتھ ہے تو ہی

کمالِ صدق و صفا و رضا و مہر و وفا

کمالِ جذب ابو بکر، مردِ راہ خدا

کلام بشیر صرفی میں دوسری منقبت بحضور حضرت علیؓ مشکل کشا کی شانِ اقدس میں بیان کی گئی ہے۔ حضرت علیؓ کی شخصیت مختلف الجہات ہے۔ علیؓ پر زمین اور آسمان کے اسرار عیاں ہیں۔ حضرت علیؓ نہ صرف اللہ کے نبی کی دامادی کا اعزاز رکھتے ہیں بلکہ آپؓ نبی پاک ﷺ کے ان چچا ابی طالب کی اولاد میں سے ہیں جو آپ ﷺ کو اپنی اولاد سے زیادہ افضل گردانتے تھے اور زندگی بھر قریشِ مکہ کی مخالفت پر آپ ﷺ کا تحفظ کرتے رہے اور ان کی وفات پر آپ ﷺ غم سے نڈھال ہو گئے اور اس سال کو "عام الحزن" یعنی غم کا سال قرار دیا گیا۔ حضرت علیؓ فاتح خیبر بھی ہیں اور تصوف کے شارع بھی باب شہر علم بھی ہیں اور اپنی ذات میں مشکل کشا بھی اور شیر خدا بھی ہیں۔

علیؓ ہے سید کون و مکاں و طرف و جہات

علیؓ ہے رمز شناس ادائے ذات و صفات

علیؓ پہ فاش ہیں اسرارِ لا مکاں و مکاں

علیؓ ہے علم کا دروازہ و علی عرفاں

علیؓ کا نام ہے مشکل کشا و شیر خدا

علیؓ کا نام تب و تاب لو لوئے لا لا

علی ؓ ہے نسبت پیغمبری سے مولائی

علی ؓ کے فقر سے روشن تمام ۔ ، ئی

ص ۹۴

حضرت علیؓ مردِ میدان بھی ہیں اور مردِ تصوف بھی۔ آپ نے فاتح خیبر ہونے کا علم اٹھائے رکھا تو دوسری طرف صوفیا کے لیے پیروی کا نمونہ بھی ہیں۔

علیؑ ہے شاہ ولائت، کمالِ عشقِ خدا
علیؑ جلالِ نبی ہے علی خصالِ وفا
ادائے دستِ خدا زور بازوئے حیدر
علیؑ محافظِ اسلام و فاتحِ خیبر

ص۹۴

حضرت علیؑ دراصل دینِ مبین کے ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اہلِ بیعت کے ہر فرد نے اسلام کی خدمت اوراستحکام میں لازوال کردار ادا کیا ہے۔ سربراہ خانہ ہونے کی حیثیت سے بشیر صرفی کربلا سے علیؑ کو الگ نہیں دیکھتے وہ خون اصغر ہو یا اکبر کی قربانی، چادرِ زینبؑ کی عصمت کا سوال یا خونِ حسین، ان سب حوالوں کو یوں بیان کرتے ہیں:

علی ؑ محافظِ اسلام و فاتحِ اسلام
علیؑ ہی فخر و غرور جناب بنتِ رسول
علیؑ خدا اور رسولِ خدا و ہے مقبول
علی ؑ ہے و اقعہ کربلا کاباب اوّل
علیؑ نے کردیا دینِ مبیں کو شاداب
علیؑ ہے چادرِ زینب علیؑ ہے خونِ حسینؑ
علیؑ ہے نور و تب و تاب عالم و ثقلین
علیؑ ہے عصمت و تقدیس اصغر و اکبر
علیؑ ہے نقش الا اللہ زیر صد خنجر
ہو دل گرفتہ غلاموں پہ اک نگاہِ کرم
علیؑ ہے رہبر و راہ و علیؑ ہے فخر حرم

ص۹۵

تیسری منقبت فارسی زبان میں ہے اس کا اسلوب سادہ اور عام فہم ہے اور بشیر صرفی کی فارسی زبان پر دسترس کا پتا بھی دیتی ہے۔ یہ منقبت بزمِ زار اقدس حضرت مہر علی شاہ گولڑہ کی شان میں کہی گئی ہے۔ پیر مہر علی شاہ کا شمار اولیا کرام میں ہوتا ہے۔ وہ فنا فی اللہ اور فنا فی رسول کے درجے پر پہنچے اور سر زمین گولڑہ شریف راولپنڈی کو شرف قبولیت بخشا۔ لوگوں کی رشد و ہدایت کا سلسلہ گولڑہ سے شروع کیا۔ آج بھی بے پناہ زائرین اپنی عقیدت کے پھول چڑھانے اس در کی حاضری دیتے ہیں۔ پیر مہر علی شاہ سے بہت سے معجزات اور کرامات منسوب ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ۲۳ سال تک عشا کے وضو سے نمازِ فجر ادا کی سچے عاشقِ رسول تھے۔ اس عشق کی انتہا یہ تھی کہ آپ نے بیداری کی حالت میں چہرہ نبی پاکؐ کی زیارت فرمائی اور آپ کے رخِ انور میں گم ہو کر نعتِ رسول مقبول لکھی۔

اس صورت نوں میں جاں آ کھاں
جاں آکھاں یا جانِ جہاں آکھاں
سچ آکھاں تے رب دی شان آکھاں
جس شان نوں شاناں سب نبیاں"

بشیر صرفی نے انھیں چراغِ رشد و ہدایت کہا ہے اور بڑی محبت اور عقیدت مند مرید کی حیثیت سے ان کی شان میں منقبت کہی ہے۔

اے چراغ رشد، اے دانائے راز
اے سراج اولیا، بندہ نواز
اے فنا فی و اللہ و فی عشقِ رسول
اے گلِ لالہ ازاں باغ مقبول
اے ترا نسبت بہ خواجہ خواجگاں
اے تیرا عظمت دریں ہر دو جہاں

مرشدی در دل بہ خو اہم انقلاب
عرض کن از من بہ آں صاحب کتاب
مدحتِ شا ہ مدینہ کن عطا
رحمت عالم ، امام انبیا
کن مر ا اسم محمد ﷺ مدعا
نیست غایت جز بہ عشق مصطفےٰ

ص ۹۴،۹۵

چوتھی منقبت بھی فارسی زبان میں ہے اور حضرت محمود شاہ صاحب کی شان میں لکھی گئی ہے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۸۷۲کو موضع سو ہا بس علاقہ تناول ہزارہ میں ہوئی۔ آپ نے خواجہ اللہ بخش تونسوئی سے چشتیہ نظامیہ میں خلافت پائی اور شریعت وطریقت کے مسائل میں مصروف عمل رہے۔ ۱۲ برس دربار غوثیہ بغداد میں درس حدیث کی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ آپ کا شجرہ نسب انتالیس ۳۹واسطوں سے سید الانبیا نبی کریم سے جاملتا ہے۔ آپ پوری جہت سے کاظمی حسینی سید ہیں اور مادری جہت سے حسینی سادات سے ہیں۔ آپ کے خاندان میں پیری مریدی کا بڑا لمبا سلسلہ چلتا ہے۔ آپ کے خاندان میں غالب مشائخ مذہباً حنفی ہوئے۔ آپ کے اجداد میں سید عبد الرحمان شاہ کشمیر میں پہلے مسلمان ہو گزرے ہیں۔ آپ کے خاندان میں اعلیٰ شخصیات گزری ہیں۔ آپ نے جامعہ الازہر سے بھی استفادہ کیا۔ آپ کو فقہ، حدیث اور تفسیر سے خاص شغف تھا۔ آپ نے ایک ہزار کے قریب کتب تصانیف کیں۔ اور مختلف شرعی تنازعات کا حل بھی پیش کیا آپ نے ۲۵ دسمبر ۱۹۹۲ء بروزجمعہ ۱۲۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔

آپ جنرل ایوب خان اور بھٹو کو نظامِ حکومت کے شرعی معاملات میں مشورے بھی دیتے رہے۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند صاحبزادہ ارجمند مفکر اسلام سجادہ نشین ہوئے۔ ہر سال ۲۴،۲۵ دسمبر کو آپ کا عرس مبارک خانقاہ محبوب آباد میں منعقد ہوتا ہے۔ بشیر صرفی غوثیہ سلسلہ سے ان کی نسبت اور اس نسبت کی بدولت چراغ رشد وہدایت ہونے کے سبب اپنا مرید مانتے ہیں اور اس منقبت میں زیادہ تر زور نسبتوں کے سلسلے کو گنوانے پر ہے اور اس تعلق سے آپ کی عظمت کا اعتراف ہے۔

اے چراغ بزم غوث پاک تو
اے غلامِ صاحب لولاک تو
بر تو دارد شاہ جیلاں آں نگاہ
زانکہ افروزد دلاں چوں مہر و ماہ
زانکہ قد مش برسر ہر اولیاء
شیخ جیلی آں امامِ اصفیاء

ص۹۸

منقبت کے ذیل میں ایک نظم بعنوان "قصیدہ بحضور مرشدنا و سیدنا حضرت زندہ پیر صاحب" شاملِ کتاب ہے۔ اگرچہ یہ اپنی ہیت میں قصیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ عہد جدید میں اس طرح فنی لوازم نبھاتے ہوئے قصیدہ لکھا بھی نہیں جا سکتا۔ کہ جدید قاری تشبیب، گریز وغیرہ کے لوازمات کے بعد مدح تک آنے کا انتظار نہیں کرتا۔ اس وضاحت کے باوجود اس کو منقبت یا دعائیہ نظم تو کہا جا سکتا ہے لیکن نہ تو قصیدے کے فنی لوازم اس میں موجود ہیں اور نہ ہی اس کا اسلوب اتنا پر شکوہ ہے کہ اسے قصیدہ کہا جا سکے۔

جناب زندہ پیر کی ولادت ۱۹۱۲ء میں کوہاٹ میں ہوئی۔ جس طرح ہر نبی اور ہر ولی کی پیدائش پر کچھ عجیب و نادر واقعات رونما ہوتے ہیں اسی طرح آپ کی پیدائش کے موقع پر ضلع کوہاٹ کا علاقہ خوشحال اور شاداب ہوا۔ اوائل عمری سے ہی جناب زندہ پیر روزہ دار اور رات بھر قیام کے خوگر تھے اور آغاز شعور سے ہی آپ کو تمام محاسن و مکارم بدرجہ اتم ودیعت کر دیے گئے تھے گویا آپ کم سنی سے ہی کامل انسان تھے۔ روایت ہے کہ ایک روز اچانک غازی بابا جو کوہاٹ کے نواحی علاقے کے رہنے والے تھے۔ انگریزوں کے سخت خلاف تھے اور اپنی تلوار ہمیشہ میان میں رکھتے تھے اور کہیں ایک جگہ قیام نہیں کرتے تھے۔ اس لیے انگریز بھی اس علاقے کو پسماندہ رکھے ہوئے تھے ان کا ایک نہر کے کنارے سے گزر ہوا زندہ پیر نہر کے کنارے کھڑے تھے غازی بابا آپ کو دیکھ کر رک گئے اور جناب کے بڑے بھائی سے فرمایا:

آپ کے یہ بھائی معمولی آدمی نہیں ہیں آثار رشد وہدایت ان کی پیشانی سے ٹپک رہا ہے مگر اس بات کو ہر آنکھ نہیں دیکھ سکتی اور ہر شخص معلوم نہیں کر سکتا یہ اپنے وقت کے بہت بڑے اولیا ہونگے ان کا کوئی ہم عصر نہیں ہو گا اور پوری دنیائے اسلام ان کی مینا باریوں سے چمکے گی۔"[۱۲]

دربار عالیہ موہڑہ شریف کے خلیفہ محمد شاہ صاحب نے فرمایا: جناب زندہ پیر کے منہ سے نکلی ہوئی دعا اللہ ہر گز رد نہیں فرماتے۔(۱۳)

زندہ پیر خواجہ رئیس اولیا غوث زماں خواجہ محمد قاسم کے دستِ مبارک پر بیعت ہوئے آپ نے ہی زندہ پیر کا لقب عطا فرمایا اور اپنی سو سال کی عبادت کا نچوڑ جناب زندہ پیر کو عطا کیا جناب زندہ پیر ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۹ء تک بارہ سال فوج سے وابستہ رہے اور اس عرصے میں اپنے مقام اور حال کو پوشیدہ رکھا۔ ۱۹۴۹ء میں گیارہ بلوچ رجمنٹ سے ایبٹ آباد چھاؤنی سے اپنے آپ کو ظاہر کیا۔ فوج سے سبکدوش ہو کر مخلوقِ خدا کی رشد وہدایت پر مامور ہوئے۔ پہلا حج ۱۹۵۲ء میں بحری جہاز کے ذریعے کیا وہاں سے آپ کو کوہاٹ کے پہاڑوں میں جا بسنے کی بشارت ملی۔ اس وقت وہ علاقہ بے آب و گیاہ تھا اور کوئی پرندہ وہاں پر نہیں مارتا تھا۔ آج جناب زندہ پیر کے فیض و برکت سے گھمکول شریف کوہاٹ کے پہاڑ تک لا الہ الا اللہ کے ذکر سے ہمہ وقت گونجتے رہتے ہیں۔ لنگر تقسیم ہوتے ہیں اور اللہ اور رسول کا ذکر ہوتا ہے۔ جناب زندہ پیر سے بے پنا معجزات اور کرامات منسوب ہیں چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ بشیر صرفی کا شمار بھی جناب زندہ پیر کے نیاز مندوں میں ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ شاعر نے بڑی عقیدت سے اور نیاز مندی سے یہ نظم کہی۔

شاہ گھمکول بہت اونچا ہے رتبہ تیرا
رکنے پاتا نہیں دریا ہے کہ فیضان تیرا
تو میرا ہادی و مرشد ہے مرا پیر ہے تو
مجھ کو کیا غم کہ میسر ہے یہ داماں تیرا
اپنے الطاف و عطا سے میری جھولی بھر دے
آگیا در پہ تیرے آج پریشاں تیرا
چہرہ پاک ہے یا مصحفِ تاباں ترا

تیرے دربار سے منگتوں کو یوں ہی ملتا رہے

شاہ گھمکاول رہے نور فروزاں تیرا

اپنے مرشد کی حضوری کی تمنا ہے مجھے

رہے گھمکاول کے گلشن میں غزل خواں تیرا

مجھ کو بس عشق محمد کا سلیقہ دے دے

تو اگر ہاتھ نہ پکڑے تو کہاں جاؤں گا

میرا سامان اگر کچھ ہے تو پیماں تیرا

ص۱۰۰،۱۰۱

مذہبی شاعری کے ضمن میں یہ پانچویں اور آخری منقبت "بحضور الحاج پیر سید الحاج پیر سید ولائت شاہ بخاری نقشبندی قادری سہروردی مرحوم" ہے۔ یہ اردو زبان کی ایک مختصر مگر جامع منقبت ہے جس طرح میر ولائت شاہ کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ ایک سلسلے اور نسبت کے حامل بزرگ تھے شاعر نے اس منقبت میں بھی ان سلسلوں اور نسبتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ نظم کہی ہے اشعار میں صاحبِ منقبت ممدوح کا نام با معنی استعمال قابلِ تحسین ہے۔

مبارک بزم ہے یہ محفل شاہِ ولائت ہے

وہ فخر اولیاء و اصفیا ماہِ ولائت ہے

یہی وہ بزم ہے جس کو ہیں زیبا رحمتیں حق کی

نبی کے عاشقوں کا گھر، ادب گاہِ ولائت ہے

ص۲۰۱

مجموعی طور پر بشیر صرفی کی مذہبی شاعری ایک عام باعقیدہ سنی مسلمان کی شاعری ہے جو ان مروج عقائد و موضوعات کا احاطہ کرتی ہے جو برصغیر کے مسلمانوں کے ہو سکتے ہیں۔ بے انتہا عقیدت وہ واحد لفظ ہے جسے ان کی حمد، نعت، منقبت کے بیان کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کہیں کہیں وہ خالص شاعر کے طور پر

ابھر کر سامنے آتے ہیں اور ان کا تغزل بلند پایہ ہو جاتا ہے لیکن عمومی رویہ عقیدت و محبت کا ہے جو مروج و معروف عقائد و اطوار سے مملو ہے۔ تاہم مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو مذہبی روایت میں بشیر صرفی ایک خوشگوار اضافہ ہیں وہ اس روایت کا تسلسل ہیں جو ابتدائے اردو شعر سے تشکیل پا چکی ہے۔

ج) بشیر صرفی کی شاعری میں اخلاقی زاویے:

انسانی زندگی دنیا میں زندگی بسر کے لیے کچھ اخلاقی زاویوں کی پابند ہے۔ کہیں تو یہ اخلاقی زاویے مذہب کی دین ہیں اور کہیں خود انسان کے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔ ہر دو صورتوں میں انسان ضابطہ اخلاق کا پابند ہے۔ لفظ اخلاق اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے۔

نسیم اللغات کے مطابق:

> اخلاق (ع) خلق کی جمع۔ عادتیں، خصائل، انسانیت، ملنساری، مروت، ملنے جلنے کا مہذب طریقہ وہ علم جس میں تہذیب، نفس، تدبیر منزل اور سیاست ملکی اصول بیان کیے جاتے ہیں۔[۱۴]

اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے مطابق:

> معاشرتی معاملات طے کرنے کے اصول وہ بات جو بھلائی اور تمیز پیدا کرے، جو فضائل اور رذائل کا علم بخشنے، ایسا ضابطہ جس کی پابندی کے بغیر اجتماعی زندگی کا تصور محال ہے۔[۱۵]

دنیا کے ہر مذہب نے ایک ضابطہ اخلاق دیا اور اس کا پرچار بھی کیا ہے۔ جو لوگ مذہب پر یقین نہیں رکھتے انھوں نے بھی ایک مثبت اور خوشگوار معاشرے کی تعمیر کے لیے اپنے آپ کو اخلاقی ضابطوں کا پابند بنایا ہے۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اخلاقیات مہذب معاشرے کی تعمیر کے لیے اعلیٰ اخلاقِ اقدار کا اطلاق ہے جس کے تحت مذہب اور معاشرے کے مقررہ اصول و قواعد کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے۔

مذہبِ اسلام دین اخلاق ہے۔ اسلام کے اخلاقی اصولوں میں اخوات، راست بازی، دیانت داری، امانت داری، ملنساری، فقر، مہر و محبت، حقوق و فرائض، سخاوت، عدل و انصاف، مساوات، عفو در گزر، وسعت

قلبی، ایثار، احسان، عیادت و تعزیت، حسنِ عمل، حسنِ سلوک، آدابِ مجلس، ایفائے عہد، زہد و تقوی انسانی ہمدردی جیسے عوامل شامل ہیں۔

جب ہم شعر و ادب میں اخلاقیات کی بات کرتے ہیں تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ادب انسان کی بنیادی اخلاقی اقدار سے آگاہی کا ایک وسیلہ ہے۔ ادیب یا شاعر اخلاقی و غیر اخلاقی اثرات کو بیان کرتا ہے تا کہ خیر و شر میں تمیز کی جا سکے۔

بشیر صرفی کا تعلق ایک مسلمان اور مذہبی گھرانے سے تھا۔ مذہبی عقیدت کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کی پاسداری ان کی ترتیب و پرورش کا بنیادی جزو رہی اور ان کی شخصیت میں رچ بس گئی۔ اور بحد ث یت مسلمان شاعر ان کے کلام میں اخلاقی زاویے، محبت و اخوت احساس انسانیت، اور سماجی اخلاقیات نمایاں ہیں۔ موضوعِ زیرِ بحث میں بشیر صرفی کے کلام میں ان اخلاقی زوایوں کا مطالعہ کیا جائے گا۔

ا۔ احساسِ انسانیت:

انسانی معاشرے میں احساسِ انسانیت پر امن معاشرے کے لیے پہلی سیڑھی کی مانند ہے جن معاشروں میں احساس نہ رہے وہاں ہر طرح کی اخلاقی خصوصیات رخصت ہو جایا کرتی ہیں شعرا میں عام لوگوں کی نسبت اخلاص، احساس و مروت کی کمی کو جلد محسوس کر لینے کی حس زیادہ ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے اُن پر ہر طرح کی صورتحال کا اثر زیادہ اور دیرپا ہوتا ہے۔

مشینی دور کے آغاز کے ساتھ ہی احساس انسانیت جیسی اخلاقی خوبیاں ناپید ہونے لگیں، منافقت موقع پرستی مبنی اور مفاد پرستی جیسے عوامل تیزی سے معاشرے کی رگوں میں سرایت کرنے لگے۔ جدید دور میں انسانوں کی جگہ جب مشینوں نے کام کرنا شروع کیا تو انسان کی وقعت کم ہوئی رایئگانی کا احساس بڑھنے لگا۔ یہ صورتحال حساس افراد کے لیے گہرے کرب کا باعث ہے اس رایئگانی کے احساس نے بشیر صرفی کو بھی متاثر کیا اس حوالے سے انھوں نے اپنے کلام میں یوں اظہار خیال کیا۔

اس ہوا کی ٹہنیوں سے پتیاں تک چھین لیں
گر پڑے مٹی میں ملنے کے لیے سوکھے گلاب
بپھری ہوئی ہوائیں درختوں پہ پل پڑیں
پھر یہ ہوا کہ شجرِ ثمردار گر پڑے
میں تمہاری ذات کے ہر کرب سے گذرا ہوں خود
اور اب مجھ کو مجھی پر کربلا تم نے کیا

جدید دور کے بدلتے ہوئے تقاضوں اور مسائل کی زد میں ہر فرد ہے ان تقاضوں کو اپنا لیا جائے تو حساس انسانوں کے لیے بے پناہ مسائل ہیں نہ اپنایا جائے تو پیچھے رہ جانے کا احساس دل میں گھر کر جاتا ہے۔نئے معاشرے نے دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ انسانیت کی ناقدری کو جنم دیا، خصوصاً مشرقی معاشرے میں احترام آدمیت اور رشتوں کا تقدس بڑا اہم تھا جس پر کاری ضرب لگی ان معاشرتی قدروں کے زوال پر بشیر صرفی کچھ یوں اظہار کرتے ہیں:

خود اپنے آپ میں رہتے ہیں گھر نہیں رکھتے
مکیں ہیں پہ کوئی بام و در نہیں رکھتے
اڑان چاہیں مگر بال و پر نہیں رکھتے
یہ نو نہال بزرگوں کا ڈر نہیں رکھتے

ڈاکٹر شفیق انجم بشیر صرفی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

بشیر صرفی کے لب و لہجے میں بلا کی حوصلہ مندی تھی وہ ایک اصول پسند انسان کی زندگی جیے اور منافقوں کے عہد میں سچائیوں کا دم بھرتے رہے یہ آسان کام نہ تھا۔[16]

نئی تہذیب کے جبر اور پھر ابتدا میں پاکستان کے اندر پیدا ہونے والے قیادت کے فقدان اس کے نتیجے میں ہر سطح سیاسی معاشی بحران نے ایک دفعہ انسانیت کے احساس کو کچل دیا۔انسان کی شناخت ختم ہو گئی۔اس بے بسی کے احساس نے بشیر صرفی کو متاثر کیا، نظم ''نارسیدہ'' کے کچھ اشعار:

دھواں دھواں اس کے حوصلے ہیں
نظر نظر شب گزیدگی کا سماں لیے ہیں
وہ بے ثمر سے شجر کی شرمندگی بنا ہے
شجر کہ جو اپنی ناکسی پر گرے ہوئے زرد پتوں کے آنسوؤں کی
دبیز چادر کی اوٹ میں اس برہنگی کو چھپا رہا ہے
کہ جس پر نادیدہ زندہ لاشیں
رکی ہوئی ساعتوں کی مانند چپک گئی ہیں
وہ شب و روز کی جکڑ میں عذاب بن کر پڑا ہوا ہے
مگر اس کی ناکسی کی حدوں کا کوئی نشان نہیں ہے

بشیر صرفی خود ایک روایتی اور وضع دار قسم کے انسان تھے۔ نئے طرزِ احساس کے نتیجے میں نیا انسانی نظام جھوٹ اور منافقت پر مبنی تھا۔ بشیر صرفی کی نظم "خود کلامی" نے بظاہر چکا چوند اور مصنوعی پن کو موضوع بنایا ہے۔

انسان رشتوں کی بھیڑ میں ہے مگر اس افرا تفری میں خود کو تنہا سمجھتا ہے۔ کسی کو کسی کا خیال نہیں ہے۔

مصنوعی تکلف ایک جھوٹی روشنی ہے
تیز نیزے کی انی بن کر میری آنکھوں میں چبھتی ہے تو لگتا ہے
کہ میرے گرد ہر اک چیز جھوٹی روشنی کے اس سمندر کی کلیں ہے
اس سے نکلے گی تو مر جائے گی کیا

"خود کلامی، ص ۴۰۲"

بشیر صرفی نے اپنی نظم ”ترجمہ“ کے عنوان سے ہمارے معاشرے کے ایک روایتی موضوع کو چھیڑا ہے۔ کہ جب عورت سسرال میں بیاہ کر آتی ہے تو وہ بھی ایک مکمل انسان ہوتی ہے۔ لیکن سسرال میں شوہر ہی ایک ایسا سہارا ہوتا ہے اس کے بغیر تو اس کو انسان ہی نہیں سمجھا جاتا عورت اپنے رشتے داروں کو چھوڑ کر آتی ہے۔ اپنی تمام تر کوششوں کے باد جود وہ سسرال والوں کا دل موہ لینے میں ناکام رہتی ہے۔ سسرال میں ایک انسان ہونے کے ناطے اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں ہوتا وہ بے بس نظر آتی ہے۔ اس صورتحال کو اپنے گھر والوں سے اس لیے نہیں بیان کر پاتی کہ وہ اب اس گھر کا حصہ بن چکی ہوتی ہے اس لیے چپ رہ کر سب کچھ سہتی ہے۔

گھر سسرال میں کتنا دکھ ہے
دکھ کا کوئی مداوا نہیں
پانی بھرنے گھر سے نکلی
ہوگئے برتن چکنا چور
میری بپتا کون سنے گا
ٹوٹا دل اور منزل دور
ساجن اب تو آن ملو
دکھ کا کوئی مداوا ہو
ہائے رے میرا رخا ٹوٹا
کس سے اور منگاؤں گی
دل میں درد کی کرچیں ہیں
کس کو حال سناؤں گی

دکھ کا کوئی مداوا ہو

بعض اخلاقی برائیاں انسان میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ خود کو دوسروں سے ممتاز کرنے لگتا ہے۔ یہ چیز تعلقات میں پھوٹ کا باعث بنتی ہے۔بشیر صرفی بھی کچھ انہی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں کہ جب ایک چھت تلے رہنے والے ایک دوسرے سے دور نظر آتے ہیں۔

ہیں ایک چھت کے تلے، راستے جداسب کے
یہ کس کے گھر کا تماشا میں اپنے گھر دیکھوں
ص۱۲۵

بشیر صرفی ایک جگہ دعا گو ہیں:

اے خدا دل کو میرے کر دے دلگد از
سنگ دلی سے اور ثقاوت سے بچا
ص۴۷

بشیر صرفی افراط و تفریط کے اس عہد میں بھی انسانیت سے مکمل طور پر مایوس اور ناامید نہیں ہیں۔ان کی ایک نظم ''خرد مند'' کے عنوان سے ہے۔ خرد سے مراد عقل اور شعور کے ہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بعض معاملات میں بے شعوری ایک نعمت ہوتی ہے کیونکہ خرد مندی یا بعض معاملات میں چیزوں کا شعور ہونے سے انسانی نشاط اور امید دھندلا جاتی ہے۔بشیر صرفی اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسان اپنے اندر کا بچہ زندہ رکھے انسان کے اندر کا بچہ دراصل اعلیٰ انسانی اقدار کی آس اور امید کی علامت ہے۔ یہ بچہ خدا پر انسان کے اعتماد اور ایمان کا مظہر ہے چنانچہ صرف عقل مند اور خرد مند ہونے کے دعوے داروں سے انھیں راہ نجات تجویز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

عقل مند!
فکرِ عقبیٰ میں زیانِ جاں تو لازم ہے تمھیں

فکر دنیا بھی بہت در پیش

اے خرد مند و ذرا تم

اپنے اندر اپنے اپنے طفلکِ معصوم کو دیکھو

کہ وہ زندہ بھی ہے

کیونکہ بچہ معصوم ہوتا ہے وہ آداب دنیا سے مبرا ہوتا ہے اور انسانوں کے درمیان تفاوت سے نابلد ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بشیر صرفی انسانوں کو اپنے اندر کے بچے کو زندہ رکھنے کا درس دیتے ہیں۔ تاکہ معاشرے میں احساس انسانیت کو بیدار رکھا جاسکے۔

۲۔ محبت و اخوت:

محبت و اخوت کا پودا احساسِ مروت اور احساسِ انسانیت کی جڑوں سے پھوٹتا ہے جہاں جذبہ احساس موجود ہو گا وہاں محبت و اخوت کا احساس خود بخود جنم لے گا۔ اخلاص محبت واخوت اور رواداری ایسی خوبیاں ہیں جن کا تعلق کسی مذہب سے نہیں بلکہ انسانی اخلاقیات سے ہے کسی بھی معاشرے میں اگر یہ سماجی رویے نہیں ہوں گے تو اخلاقی طور پر معاشرہ تنزلی کا شکار ہو گا۔بشیر صرفی اپنے معاشرے کی اخلاقی تنزلی پر بھی نوحہ کناں ہیں وہ اس سے نظریں چراتے نہیں بلکہ انھیں اپنا موضوع سخن بناتے ہیں۔

خود اپنے زہر کو لوگ اپنے آپ چاٹتے ہیں

محبتیں ہیں مگر اپنے آپ کے سوا

عرصہ دہر میں اخلاص کی قیمت کیا ہے

میرے جذبے سرِ بازار ہیں نالاں اے دل

بشیر صرفی ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے صبر و تحمل اور برداشت کا درس دیتے ہیں اور رجائی نقطہ نظر ہے۔

صبر کر ظلمت میں سورج کی طلب میں مت نکل
رات بھی جائے گی آخر بیت دروازہ نہ کھول

ص ۱۱۳

بشیر صرفی احساس و محبت کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ اپنی نظم "خود کلامی" میں وہ لکھتے ہیں:

میں بھرے بازار میں تنہا کسے اپنا کہوں
یہ تعلق درایاں رشتے یہ وضع داریاں
سب دکانیں ہیں دکانوں پر چمکتا مال ہے لیکن عذاب
اک عذاب بے ثمر

(خود خلامی ص ۲۰۴)

بشیر صرفی کو اس بات کا شدت سے ادارک ہے کہ اخلاص و محبت کی جگہ بناوٹ اور دکھاوے نے لے لی ہے لوگ دوسروں پر سبقت لے جانے میں لگے رہتے ہیں اور جھوٹی دنیا بسائے ہوئے ہیں جہاں اخلاص و محبت کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی ہے۔

اجنبی لگتے ہیں اب سارے شناسا چہرے
کھو گئے شہر میں سب اپنے مہرباں اے دل

ص ۱۳۱

بشیر صرفی ان سب حقیقتوں کا شعور رکھنے کے باوجود محبت واخوت کی خاطر دنیا کی عارضی لذتوں کو اور خوشیوں کو دوسروں میں بانٹنے کا درس دیتے ہیں۔

جسے میسر ہو دھوپ میں ایک شجر کی چھاؤں
اسے یہ کہنا تمازتوں میں شجر کے جلنے کا بھی ذرا خیال رکھنا

ادائے فردا میں فکر فردا لپیٹ رکھو تم آج کی شب

میں بے خودی میں ہوں ہر حقیقت سحر کے آنے پر ٹال رکھنا

۳۔ سماجی اخلاقیات:

معاشرتی نظام کی خوبی کا انحصار اس کی اخلاقیات پر ہوتا ہے۔ انسان اگر پر سکون زندگی کا خواہاں ہے تو اسے دوسرں کے حقوق کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے ان حقوق میں عزت، سچائی، برابری، انصاف، احساس انسانیت اور دیگر بہت سی اخلاقی خوبیاں آتی ہیں۔ وگرنہ سماج میں منفی رویے جنم لیتے ہیں۔

سماجی اخلاقیات کا بہترین نمونہ خود بشیر صرفی کی اپنی ذات تھی۔ بشیر صرفی استعداد و قابلیت رکھنے کے باوجود انہوں نے شہرت کی خاطر اپنی استعداد کی نمائش نہیں کی اور اپنے کلام کو اپنی زندگی میں طبع نہیں کروایا اور نہ ہی ناموری کے لیے انہوں نے مروج ہتھکنڈے استعمال کیے۔ ادب سے ان کی دلی وابستگی کے بارے میں ڈاکٹر شفیق انجم رقمطراز ہیں:

> لکھنے والوں کی انجمن، استاد غلام رسول کی محفلیں، حلقہ ارباب ذوق اور اس کے ساتھ لکھنے والوں کی نجی ادبی مجالس میں بشیر صرفی اپنی تمام ملازمتی مصروفیات کے باوجود شرکت کرتے اور اس دور کی ادبی سرگرمی میں اپنے کردار کو یقینی بناتے خصوصیت کے ساتھ ان کا تعلق رشید امجد اور وقار عزیز سے تھا۔ رسول طاؤس نے اپنی ایک نظم میں اس گروپ کو ایک مثلث کہا ہے۔ بقول ان کے تثلیث کے یہ مسافر جو تازہ دم تھے نئی منزلوں کی دھن میں گویا سن ساٹھ کی دہائی کے چلتے پھرتے پیامبر تھے۔ بشیر صرفی سن ساٹھ اور مابعد کی دہائیوں میں ایک ممتاز شاعر، ادیب اور صحافی کی حیثیت سے نمایاں ہوئے اور اپنے عہد کے ادبی تحرک میں انھوں نے بہت فعال کردار ادا کیا۔[۷۱]

بشیر صرفی اپنے کلام کے حوالے سے صلے یا ستائش کی تمنا نہیں رکھتے تھے۔ شاعر حساس ترین فرد ہوتا ہے وہ دورانِ دل کے ساتھ ساتھ سماجی حقائق کا بھی شاہد ہوتا ہے اور ان پر رد عمل بھی ظاہر کرتا

ہے۔انسانی منفی رویے بے خبری،بے حسی اور منافقت کسی بھی معاشرے کے لیے ناسور سے کم نہیں ہوتے۔بشیر صرفی معاشرے کی ان اخلاقی بدصورتیوں پر یوں رد عمل ظاہر کرتے ہیں۔

محفل میں کوئی آنکھیں کھولے سناٹا سا پائے
سب اپنے اپنے دھیان میں گم ہیں اٹھ کر تاریکی کردو
میرے اجڑنے سے بستے ہو گر تم بس جاؤ
اپنا گھر آباد کر لو میرا غم نہ کرو

وہ جانتے ہیں کہ اس مطلبی اور خود غرض دنیا میں متاعِ خلوص کی قدر کسی کو نہیں۔کسی کی اچھائی کو اس کی کمزوری سمجھا جاتا ہے۔

ہماری اخلاق مندیوں کی نہ تھی اگر قدر، وجہ یہ تھی
کہ ہم کو دشمن کے واسطے بھی نہ آیا دل میں ملال رکھنا

چنانچہ وہ اس امر پر نوحہ کناں ہیں کہ دنیا میں کے بندے بے شمار مل جاتے ہیں۔ جسے صحیح معنوں میں بندہ کہہ سکیں وہ کمیاب ہے۔

یوں تو ملتے ہیں ہر طرح کے لوگ
بندہ بندگان نہیں ملتا

پھر ساٹھ اور ستر کی دہائی عالمی سطح پر طبقاتی کش مکش پھر ملکی سیاسی صورتحال، ہے عیب کی تلاش، ذاتی دکھ پھر جسم وجاں کی دوری، جدید انسان کی دانشوری کے نمایاں وصف ہیں ان حالات کے پیشِ نظر بشیر صرفی کے ہاں بھی نارسائی، بے چینی۔اضطراب، بیگانی، جیسے جذبات ابھرے اخلاقی اقدار کی شکستگی نے انسان کو بے بس کر دیا۔

چنانچہ بشیر صرفی یوں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں:

وہ رات ٹوٹی ہے ہم پہ یارو کہ جس کی کوئی سحر نہیں ہے

کہ اپنے ادراک ووہم کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے

ایک ایسی تشکیک کا عمل ہے

کہ جس سے اقدار کا سراپا خجل خجل ہے

سفر ہے درپیش جس سے کوئی مفر نہیں ہے

شبِ سیاہ کی سحر نہیں ہے

اک ایسی آواز آرہی ہے جس نے ہر ساز کا ترنم دبادیا

کہ حرف شریں بھی بے اثر ہے

چلو کہ درپیش ہم سبھی کو نیا سفر ہے

انسانی ترقی کی قیمت انسان کو اقدار کی شکست و ریخت کی صورت میں ادا کرنی پڑی مادی ترقی درحقیقت انسان کے پرانے نظامِ اقدار اور عقائد پر کاری ضرب کی حیثیت رکھتی ہے۔جو انسانی اخلاقی اقدار کی شکستگی کی صورت میں خسارے کا سودا ہے۔اندھیرے کا سفر اختتام پذیر ہوتا نظر نہیں آتا۔بشیر صرفی کی نظم ”بے سفر مسافر“ کا موضوع بھی یہی ہے۔ انسانی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کسی امید یا آس کا نظر نہ آنا،فرسودہ رسموں سے نجات اور بے چہرگی کا احساس، مصنوعی چہرے گویا ظاہر و باطن کی جنگ سے نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا سودوزیاں کے احساس کے ساتھ آخر میں رجائی نقطہ نظر بھی ملتا ہے۔

کوئی کہتا ہے ہم سر بریدہ درختوں کے ماتم میں جی کا زیاں کیوں کریں

اپنی تنہائیاں حد آفاق تک پھیل جانے پر بھی

نخلِ امید پہ برگ آتے نہیں

اجنبی رہگذر پہ کوئی دھیمے قدموں سے گزرا تو کیا

ساری پابندیوں اور فرسودہ رسموں کی کالی لکیروں کو دفنا چلیں

اور گردن پہ بس اک چہرہ نہ رہے

اور مصنوعی چہروں کو دریا کی لہروں میں پھینکیں کہیں
یا انھیں نذرِ آتش کریں

بشیر صرفی کی نظم "قتل" دراصل تیرگی اور اجالے کے مابین جاری تصادم کا نوحہ ہے۔ جس میں تیرگی روشنی کی کرن کو کھا جاتی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے بیان کیا ہے کہ موجودہ عہد میں اخلاقی اقدار کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ جھوٹ، منافقت اور مادیت پرستی عام ہے۔ تو شاعر نے حق و باطل کے درمیان کشمکش کو بیان کیا ہے۔ حق روشنی کی کرن رباہےطاو تاریکی ہے موجودہ دور جس میں انسانی اخلاقی اقدار کی سگسہ ی گی کا عمل جاری ہے۔ چہرے پر نقاب نے دوست دشمن کی پہچان ختم کر دی۔ بشیر صرفی بیان کرتے ہیں:

ہے دوست تو مسرت میں کیو ں شریک نہیں
ء . یہ . م ہے تو بھلا وار کیوں نہیں کرتا

تو ایسے میں حق کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ بظاہر منافقت اور جھوٹ کا دور ہے۔ تاریکی ہر طرف غا لب ہے۔ مادیت پرستی نے حق اور باطل میں فرق کرنا دوبھر کر دیا ہے۔ ایسے میں سچائی کی ہلکی کرن ایک امید تو ہو سکتی ہے لیکن کالی رات کی تاریکی اس کو نگل جاتی ہے۔

گویا موجودہ عہد میں برائی جیسے غالب رویے کا مقابلہ آسان نہیں بشیر صرفی کا کلام اس اندھیرے اجالے کی اس آویزش کا آئینہ ہے اور آئینہ بھی شفاف اس شفاف آئینے میں تاریکی جو مقدار میں زیادہ ہے اس کا عکس صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ بشیر صرفی کسی حسن مجسم کا سہارا لے کر اس سے فرار کی تمنا کرتے ہیں۔

تم نہیں ہو تو مری زیست ہے تعزیر ---- آؤ
اس سے پہلے کہ کٹے سانس کی زنجیر ---- آؤ
اس بیاباں میں کوئی سایہ گل ہی ڈھونڈیں
ہے تصر ف میں بہت یاد کی جاگیر ---- آؤ

"نظم" ص۶ ۲۲

والدین اور اولاد سے انسیت ہماری مشرقی تہذیبی روایات کا حصہ ہیں اس ضمن میں بشیر صرفی نے اپنے والد کی پہلی برسی کے موقعے پر نظم "نالہ دل" لکھی جس میں والد محترم کی محبتوں کا اعتراف کیا اور اپنے بڑے بیٹے سجاد حیدر کی سالگرہ کے موقعے پر نظم "سجاد کے نام" لکھی جس میں معصوم بچے کی معصوم اداؤں کا ذکر کرتے ہیں اور ڈھیر ساری دعائیں دے کر اپنی اولاد سے محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ اپنے رشتوں سے محبت کا یہ انداز ہماری مشرقی اخلاقی اقدار میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

مجموعی طور پر بشیر صرفی نے اخلاقی حسیت کو اپنی نظموں میں جس طرح سمویا ہے اپنی مثال آپ ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر، جدید اردو ادبیات، فیروز سنز، لاہور، پاکستان، ۱۹۷۸ء

۲۔ مسعود حسن رضوی، ادیب، روح انیس، کتاب گھر، لکھنو، ۱۹۷۳ء، ص ۱۹

۳۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، مقدمہ کلام بشیر صرفی، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۲۰

۴۔ مقبول بدخشانی، مرزا، اردو لغت، بحوالہ اردو نعت گوئی اور فاضل بریلوی، از ڈاکٹر عبد النعیم عزیزی ادارہ تحقیقات امام احمد رضا انٹرنیشنل، کراچی، پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص ۴۳۷

۵۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، بحوالہ اردو میں نعتیہ شاعری، ازڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، اکتوبر ۱۹۷۶ء، ص ۲۱

۶۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، مقدمہ کلام بشیر صرفی، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۲۰

۷۔ نور اللغات، جلد چہارم، مولف، نور الحسن، قومی کونسل برائے فروغ، اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۳۱۹

۸۔ بحوالہ اردو نعت گوئی کا ارتقاء، مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی، محمد شفیع، لکھنو یونیورسٹی، لکھنو، ص ۱۵۳

۹۔ https://minhajsisters.com/urdu/tid/45080

۱۰۔ http:// www.google.com.pk/search?

۱۱۔ www.tajdaregolra.com
Pir-Mehr-Ali-Shah-Golra-Sharif.html

۱۲۔ رب نواز صوفی، (مرتب و مولف) کنزالعرفان گھمکاول شریف، کوہاٹ، س ن، ص ۲۳

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۵

۱۴۔ نسیم اللغات، (اردو) مرتبین: سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، لاہور، غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۹ء، ص ۵۸

۱۵۔ اسلامی انسائیکلوپیڈیا، مرتبہ، مولوی محبوب عالم، ترتیب و تدوین سید عاصم محمود، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، س ن، ص ۵۹

۱۶۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، مقدمہ کلام بشیر صرفی، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۲۲

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۶

باب سوم

بشیر صرفی کی شاعری میں رومانوی عناصر کا تجزیہ

الف) رومان اور شاعری کا تعلق:

انیسویں صدی کے ربع آخر تک ہندوستان کے ساکن اور منجمد ذہنی اور دانشورانہ فضا کے خلاف ایک انقلاب کے لیے زمین ہموار ہو چکی تھی۔

اس ضمن میں ڈاکٹر محمد اشرف خان لکھتے ہیں:

> نئی صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ہندوستان ذہنی، تہذیبی، تمدنی، سیاسی اور معاشی لحاظ سے قرونِ وسطے[۱] سے عہد جدید میں داخل ہو رہا تھا اردو ادب میں یہ انقلاب رومانوی تحریک کی صورت میں داخل ہوا۔[۱]

گویا رومان کی مختلف صورتوں نے باقاعدہ ایک تحریک کی صورت اختیار کی۔ ابتدا میں رومان کا لفظ زبان کا نام تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن بیان کرتے ہیں:

> رومانیت کا لفظ رومانس سے نکلا ہے رومانس زبانوں میں اس کا اطلاق ہوتا تھا جو انتہائی آراستہ و پیراستہ اور پر شکوہ پس منظر کے ساتھ عشق و محبت کی ایسی داستانیں سناتی تھیں جو عام طور پر دور وسطی کے جنگ جو اور پر خطر نوجوانوں کی مہمات سے متعلق ہوتی تھیں اس طرح اس لفظ سے تین خاص مفہوم وابستہ ہو گئے۔
>
> ۱۔ عشق و محبت سے متعلق چیزوں کو رومانوی کہا جانے لگا۔
>
> ۲۔ غیر معمولی آراستگی، شان و شوکت، آرائش، فروانی اور محاکاتی تفصیلی پسندی کو رومانوی کہنے لگے۔
>
> ۳۔ عہد وسطی سے وابستہ تمام چیزوں سے لگاؤ اور قدامت پسندی اور ماضی پرستی کو رومانوی کا لقب دیا گیا۔[۲]

بعد ازاں آہستہ آہستہ یہ لفظ ادب کے مخصوص مزاج کا مظہر بن گیا۔ ادبیات میں وارٹن اور ہرڈ نے یہ لفظ سب سے پہلے استعمال کیا۔ اس تحریک کا باقاعدہ آغاز فرانس میں روسو سے ہوا۔ رومانویت کو عقلیت پسندی، اصول پرستی اور میانہ روی کی ضد قرار دیا جاتا ہے، ایک حد تک یہ تحریک کلاسکیت کی ضد تھی مگر مکمل طور پر یہ اس سے فرار کی حامل نہیں تھی۔ رومانویت جدید حالات کے تحت نئی دنیاؤں کی تلاش کے لیے سرگرداں تھی نئی اقدار کی بازیافت کی خواہاں تھی لہٰذا ہر اس تحریک کو جو قدما کے اصولوں سے انحراف پر مبنی ہو اور تخیل و جذبے کی راہ میں حائل ہو رومانویت سے منسوب کر دیا گیا یہی وجہ ہے کہ نیچرل ازم اور اظہاریت کو رومانویت کی مختلف شکلیں قرار دیا گیا۔

رومانویت انگریزی ادب سے اردو میں منتقل ہوئی۔ اردو میں یہ تحریک سرسید کی اصلاحی تحریک کا رد عمل بھی معلوم ہوتی ہے پھر مخزن نے بھی سرسید تحریک کی طرح جب انفرادیت کو اجتماعیت میں بدلنے کا درس دیا تو فرد بے چہرہ ہو گیا۔ اس کا رشتہ روحانی وجدانی سرچشموں سے الگ ہوا۔ پھر انگریزی ادب کے ہندوستان میں متعارف ہونے سے مغربی رومانوی شعرا کے افکار تک رسائی نے ان چنگاریوں کو ہوا دی یوں حقیقت پسندی کے خلاف رد عمل شروع ہوا۔ عقلیت پسندی نے انسان کو مجبور اور بے بس بنا دیا تھا۔ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جاتا تھا۔ پھر حقیقت پسندی مذہب کے الہامی مزاج سے مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ سائنسی عقلیت پسندی نے بھی انسان کی انا کو مجروح کیا۔ اس حقیقت پسندی، جمود اور یکسانیت کی فضا کو توڑنے کے لیے ایک تحریک کی ضرورت تھی جو رومانوی تحریک کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ رومانوی تحریک کے ادبا نے شاعرانہ اسلوب، حسن و عشق کے ... یہای بیان اور خواب ناک فضا کو قبول کرتے ہوئے یوٹوپیا کے خواب بھی دیکھے۔

مخزن کے اجرا سے کئی نوجوان ادبا اس میں شامل ہوئے۔ اقبال، یلدرم، آغا قزلباش، ابو الکلام آزاد، ظفر علی خان، مرزا سعید، شیخ عبد القادر اور خوشی محمد ناظر نے رومانوی تصورات کا پرچار کیا۔

رومانویت پسند حسن فطرت کے بھی دلدادا تھے۔منظر نگاری کی طرف بھی انہوں نے خصوصی توجہ دی اور ادب کو اجتماعیت کے بجائے انفرادی خیالات و محسوسات کا پابند بنایا۔ سرسید نے اگر حقیقت نگاری پر زور دیا۔تو رومانوی ادبا نے جذباتِ حسن اور عشق کی تصوراتی دنیا کی تخلیق کی اردو ادب میں رومانی تحریک کو انگریزی ادب ہی کی رومانوی اور جمالیاتی تحریک سے تعصب کا نتیجہ نہیں کہا جاسکتا،یہ تحریک ہمارے اپنے سماجی حالات اور ادب میں ہماری اخلاقیات کے رجحان کا رد عمل بھی ہے یہی وجہ ہے کہ رومانوی تحریک میں شاعرانہ اسلوب کے علاوہ حسن اور صنف نازک کا خاصا عمل دخل ہے۔

اردو ادب میں رومانوی تحریک کو اقبال کی روایت شکنی، ٹیگور کی ماورائیت اورابو الکلام کی انفردیت نے خاص طور پر جلاِ بخشی اقبال کو رومانوی تحریک کا ابتدائی شاعر سمجھا جاتا ہے جدید اردو نظم کی تشکیل میں اقبال کے رومانوی زوایہ نگاہ کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

حفیظ جالندھری رومانوی شعرا میں اہم نام ہے۔ان کے ہاں غالب جذبہ وطن سے محبت کا ہے۔وہ ہندوستان کو دلہن کی مانند تصور کرتے ہیں اور اس کی جھلک کے لیے کوشاں رہتے ہیں ان کی شاعری میں کوشاں روایات اور اپنی تہذیب سے لگاؤ،لااُبالی پن،بے فکری، مسکراہٹ،،رنج و غم اورلطافت سب رنگ موجود ہیں۔ان کی رومانیت کا عمدہ ترین اظہار ان کی رنائیت میں ہے انہوں نے بحروں کے انتخاب اور الفاظ کی ترکیب سے آہنگ نغمہ پیدا کیا۔حفیظ نے نغمے کی ترتیب میں جو تبدیلی پیدا کی وہ اس بات مظہر ہے کہ شاعر فکر و تخیل کے بجائے جذبات کو بنیادی اہمیت دیتا ہے اور جذبے پر ترنم کی تربیت اور موسیقی کی ذمہ داری چھوڑ دیتا ہے۔

یہ آسمان یہ زمیں　　　نظارہ ہائے دلنشیں
پئے حیات آفریں　　　بھلا میں چھوڑدوں یہیں
ہے موت اس قدر قریں　　　مجھے نہ آئے گا یقین
نہیں نہیں ابھی نہیں　　　ابھی تو میں جوان ہوں

شاعری میں یہ رجحان زیادہ واضح شکل میں اختر شیرانی کے ہاں ملتا ہے۔ اختر شیرانی کے بارے میں ڈاکٹر محمد حسن بیان کرتے ہیں:

> اختر یا رومانوی شاعر ہیں یا کچھ نہیں۔ جسے رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں کبھی بچے اور کبھی مجذوب ہونے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اختر شیرانی کی شاعری میں حُسن کی یہی بے باک تلاش ہے۔[۳]

زندگی کو ایک ماورائی خواب بنانے اور اس میں تخیل کی رنگ و رعنائی سمونے میں اختر نے سب سے زیادہ [illegible]گی کا مظاہرہ کیا۔ جس کی وجہ سے وہ اولین رومانوی شعرا میں شمار ہوئے۔ اختر نے پردے میں محصور عورت کو شاعری کی خارجی سطح پر پیش کیا۔ جس سے رومان محبت کا ہم معنی لفظ بن کے اُبھرا، اختر عورت کے حسن اور اس کی محبت کو خلاصہ کائنات سمجھتے تھے۔ ان کی شاعری میں عورت مختلف ناموں سے ظہور پذیر ہوئی۔

کبھی سلمی رومان حسین کے تذکرے کیجیے
کبھی عذرہ کے افسانے کو عشق رائیگاں لکھیے
کبھی پروین کے مرگ عاشقی پر فاتحہ پڑھیے
کبھی شمسہ کے زہر آلودہ ہونٹوں کا بیان لکھیے

مگر ان کی رومانیت میں فکری گہرائی موجود نہیں۔

جوش ملیح آبادی کی شاعری میں جذباتی اُبال بنیادی اہمیت رکھتا ہے ان کے مجموعہ کلام ''روح ادب'' میں رومانویت فکری آزادی اور تخیل کے حسن کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ جوش نے خارجی حسن کو اہمیت دی وطن سے محبت کا جذبہ بھی نمایاں ہے۔ استعمار کے خلاف گھن گرج بھی ان کی شاعری کا حصہ ہے جوش کو شاعر شباب اور شاعر انقلاب بھی کہا گیا۔

برس جاتے ہیں موتی برق سی کوند جاتی ہے
کچھ اس انداز سے وہ مسکرا کر جام لیتے ہیں

الطاف مشہدی اختر شیرانی کی جہت کا ایک اور نمائندہ شاعر ہے۔الطاف نے بھی عورت کے حسن کو بنیادی اہمیت دی جس کی وجہ سے ان کے ہاں موضوعات محدود رہے۔احسان دانش کی رومانویت غربت کے احساس سے جنم لیتی ہے۔ان کی کائنات چھوٹی چھوٹی خواہشوں اور مسرتوں سے عبارت ہے،خوابوں کی شکستگی ان کا بنیادی المیہ ہے۔ان کے ہاں خود فراموشی کی کیفیت نمایاں ہے۔

صدائے آبشار میں　　　برس رہی ہیں مستیاں
مچل رہی ہیں فطرتیں
بدل رہی ہیں کروٹیں　　　تڑپ رہی ہیں بجلیاں
شمیم زلف چور ہے

دیگر رومانوی شعرامیں اختر انصاری، حامد اللہ افسر،ساغر نظامی اور روش صدیقی قابل ذکر ہیں۔حامد اللہ افسر کی رومانویت میں بچپن کے لطیف اور معصوم خواب ہیں۔اختر انصاری کی شاعری غمِ دل اور غمِ کائنات سے عبارت ہے۔روش صدیقی کے ہاں وطن سے محبت کا جذبہ ہے۔

ساغر نظامی نے حفیظ جالندھری،اقبال اور ابو الکلام آزاد کے اثرات قبول کیے۔اور اسی سے اپنی انفرادیت پیدا کی۔

ہواؤں کا ترنم ، بحرو بر کا شور سب کیا ہے
میرا اک نغمہ ہے جو سوادا سے کار فرما ہے

رومانوی تحریک نے تقریباً تیس چالیس برس تک نوجوان اہل قلم کو اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔اس تحریک نے لفظ خیال اور نئی جہتوں کو آشکار کیا۔جذبے کو بلند پروازی سکھائی اسلوب میں جدت پیدا

ہوئی۔ شاعری نغمگی کا دوسرا نام بن گئی یہاں رومانوی تحریک اختتام پذیر نہیں ہوئی۔ کیونکہ رومانویت ایک جذبہ ہے اس کا اظہار ہر انسان خواہ وہ شاعر ہوا، ادیب یا عام انسان کسی نہ کسی صورت میں ضرور کرتا ہے۔

ایبایاں۔ آر۔ فرست اس ضمن میں بیان کرتے ہیں:

> جذبہ رومانیت آج بھی مشرق و مغرب کی تحریوں مدیں کسی نہ کسی طور پر شامل ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی جذبہ محبت کی بنا پر قائم ہے اور آج کے سائنسی دور میں یہ جذبہ پہلے سے زیادہ وقعت اور اہمیت کا حامل ہے اس میں مسلسل ارتقا موجود ہے جو انسان کو مائل بہ ترقی رکھتا ہے اور نئے جہانوں کی تلاش پر اکساتا ہے۔ [۴]

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ رومان کا لفظ اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے۔ شاعر یا ادیب خواہ کسی بھی تحریک سے وابستہ ہو رومانوی جذبے سے خالی نہیں ہو گا بشیر صرفی کا تعلق بھی انہی شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ باقاعدہ طور پر رومانوی شاعر نہیں تھے۔ وہ سن ساٹھ کی دہائی کی جدیدیت کی تحریک سے وابستہ تھے۔

۱۹۶۰ء میں اردو ادب میں جدیدیت کے زیر اثر رومانویت کی ایک بار پھر بھی تجدید ہوئی۔ تشخص اور ذات کی تلاش کا مرحلہ ایک دفعہ پھر درپیش ہوا۔ انفرادیت کے بجائے باطنیت پر زور تھا۔ فضا شعوری طور پر چونکا دینے والی تھی مگر خواب کی اہمیت مسلّم تھی علامت کے پردے میں خواب کا التزام رومانویت کی ہی ایک کڑی تھا یہی رومانوی اثرات بشیر صرفی کے ہاں موجود ہیں جو کبھی خواب کی صورت میں، کبھی ماضی پرستی کی صورت میں، کبھی وطن کی محبت کی صورت میں تو کبھی آلام و روزگار کی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔ موضوع زیر بحث میں بشیر صرفی کی شاعری میں رومانوی عناصر کا جائزہ لیا جائے گا۔

ب) بشیر صرفی کی شاعری میں عشقیہ رومانویت:

بشیر صرفی براہ راست رومانوی تحریک سے وابستہ نہیں تھے لیکن انہوں نے ساٹھ ستر کی دہائی کے شعرا کی خصوصیات کلام کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے اور روایت کا دامن بھی اپنائے رکھا یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار اردو کے روایتی اور جدید شعرا میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

> بشیر صرفی کی شاعری موضوعات اور فنی و فکری حوالوں سے جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ اس میں غصیلے نوجوان کا فکری تناؤ بھی ہے۔ اور بزرگی کی دانش بھی رومانویت ایک ایسی فکری تحریک تھی کہ کوئی شاعر یا ادیب اس سے وابستہ ہو یا نہ ہو اپنی ذات میں ہر انسان یا شاعر و ادیب رومانوی ضرور ہوتا ہے۔[۵]

رومانویت ایک ایسی فکری تحریک تھی کہ کوئی شاعر یا ادیب اس سے وابستہ ہو یا نہ ہو اپنی ذات میں ہر انسان یا شاعر و ادیب رومانوی ضرور ہوتا ہے۔ ہر شاعر کا کلام اس کی ذاتی سوچ کا عکاس بھی ہوتا ہے، اس کے ہاں زندگی کے تجربات و مشاہدات بھی ہوتے ہیں وہ خواب بھی بنتا ہے، عشق و محبت کا اظہار بھی کرتا ہے، محبوب سے اظہار محبت ہو یا انسانیت کا درد ہو، بشیر صرفی کا کلام زندگی کے حقائق کو بھی منظر عام پر لاتا ہے۔ جس میں اُن کے ذاتی دکھ بھی ہیں اور اجتماعی بھی ان کا کلام پڑھنے والے کو اپنا دکھ بھی معلوم ہوتا ہے۔بشیر صرفی کے ہاں ذات و کائنات کے مسائل پر غورو فکر کے ساتھ ساتھ عشق، غم ہجراں، تنہائی، انتظار، یاد اور جبر کے لہریے بار ہا بنتے ہیں۔ اردو شاعری خصوصاً غزل میں عشق و محبت کا اظہار پسندیدہ اور سدا بہار موضوع رہا ہے۔ لہذا کسی بھی شاعر کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ روایت سے ہٹ کر یا کٹ کر ایک نیا راستہ نکالے۔بشیر صرفی کے مجموعہ کلام "کلام بشیر صرفی" میں ۹۳ کے قریب غزلیں ہیں جس سے غزل سے ان کی پسندیدگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر شفیق انجم کے مطابق:

> بشیر صرفی کی شاعری کا ایک بڑا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس صنف پر انھوں نے خصوصیت کے ساتھ توجہ دی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ غزل کا اظہار ان کا محبوب ترین ذریعہ ہے یہاں انھوں نے بڑے جم کر شعر کہے، اور بشیر صرفی کو اگر تلاش کرنا ہو تو یقیناً ان کی غزلوں کے بیچوں بیچ وہ ہیں۔[۶]

بشیر صرفی کی تکمیلیت پسندی ان کے کلام کی اشاعت میں بڑی رکاوٹ بنی رہی، لیکن طباعت کے بعد ان کا کلام یقیناً ایسا ہے کہ اُس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ہجر کا موضوع شعرا کا محبوب اور روایتی موضوع ہے۔

بشیر صرفی کے ہاں بار بار ابھر کر آنے والے موضوعات میں ایک موضوع ہجر ہے۔ ان کے ہاں ہجر کہیں تو وصل سے بڑی عبادت ہے اور کہیں مقصدِ محبت۔ ہجر کی لذتیں بے کراں ہیں اور وصل ایک عارضی خوشی، ہجر میں وصل کا سوچنا کسی کے لیے حرزِ جاں ہے تو کسی کے خیال میں ایسی باتوں سے محبت میں کمی کا امکان ہوتا ہے۔ ہجر دراصل کسی بھی جذبے سے زیادہ طاقتور اور پاکیزہ جذبہ ہے یہ نہ صرف محبت کی پہچان کراتا ہے بلکہ محبوب کی کشش اور اس کی طلب کی شدت ناپنے کا آلہ بھی بن جاتا ہے۔

شہرِ ہجراں سے لائی گرد ہوا
جس کا چہرہ چراغ ایسا تھا

کہیں ہجر ان کا غم گسار بن جاتا ہے جو سناٹے میں ان کی دلداری کرتا ہے۔

کُو بہ کُو چھا گیا ہے سناٹا
ہجر ہے غم گسار سونے دے

کہیں وصل میں بھی انھیں ہجر کا موسم یاد رہتا ہے۔ کہ وہ جانتے ہیں کہ ہجر کے موسم طویل تو ہو سکتے ہیں دیرپا نہیں ہو سکتے۔

رنگ آنکھوں میں بہت اس کے سجا کے رکھنا
نقشِ ہجراں بھی مگر دل میں بسا کے رکھنا

یہ ہجر ان کو اس لیے بھی عزیز ہے کہ اس میں یادیں ان کی رفیق ہیں۔

کام یادوں کی رفاقت آئی
ورنہ میں ہجر میں تنہا ہوتا

کہیں یہی ہجر درد دل کی دوا ہے۔ یہ درد ہجر ہی ہے جو ان کی شبوں کا روشن چراغ بن کر مہکتا رہا۔ اپنی مستقل مزاجی میں ہجر تمام روشنیوں کو مات دے دیتا ہے۔

تعبیر کی تلاش میں ہر خواب رہ گیا
ہم نہ رہے یہ عالمِ اسباب رہ گیا
پچھلے پہر کی روشنیاں تھک کے سو گئیں
بس اک شب ہجر تھا، شب تاب رہ گیا

ہجر اور محبوب کی یاد کا بندھن عمر کے آخری حصے تک بھی ٹوٹنے نہیں پایا۔ زندگی کے ہر قدم اور موڑ پر محبوب کی یاد ان کا اوڑھنا بچھونا ہے کبھی یہ یاد محبوب کے پرانے گھر کی طرف لے جاتی ہے اور اس کے درودیوار سے اس کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ تو کبھی اس کی گلیوں میں سکون پاتے ہیں۔ یہی چیز انھیں ہر وقت محبوب کے انتظار میں بیٹھے رہنے پر اکساتی ہے۔ انتظار اور یاد کے لہریے اور مختلف صورتوں میں ڈھل کر اظہار پاتے ہیں، یوں یاد اور انتظار کو چولی دامن کا ساتھ بنادیتے ہیں۔

اب کے وہ آئی تو پیغام شفا دے جائے گی
تشنہ دیوا ر کو آبِ بقا دے جائے گی
عجیب ہجر کے موسم کی کیفیت تھی بشیر
کہ انتظار بھی تیری اداؤں جیسا تھا

لیکن ایںطا ر اور یاد کے یہ لہریے بے لگام نہیں اور نہ ہی منہ زور گھوڑے کی طرح آزاد ہیں، بلکہ ان میں برداشت، عزم و حوصلہ اور سہار سنبھال موجود ہے، گو ہر جگہ یہ ضبط قائم نہیں بھی رہتا، یہیں کہیں ضبط کے بندھن ٹوٹ جانے اور رات کی خاموشی میں زار و قطار رونے کے منظر بھی ہیں۔ بشیر صرفی کی شاعری سے

یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غم و کرب کے پہاڑ بھی ٹوٹے ہیں مگر ان کے لہجے میں بلا کی برداشت اور حوصلہ ہے جو کبھی کبھی قاری کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

خود کلامی میں بھی اس کا نام نہ آئے صرفی
عیب کی طرح محبت کو چھپا کے رکھنا
شاید اس پر میرے ضبط کا احوال کھلا
ٹوٹ کر ابر کی مانند ستم گر برسا

بشیر صرفی کے ہاں روایتی عشقیہ مضامین کی فراوانی ہے۔ معیاری شاعری اس وقت ظہور پذیر ہوتی ہے، جب فنکار معاملات حسن و عشق، جذبات و احساسات اور فکر کے دھاروں کو اپنی روایات و اقدار اور اظہار کے ساتھ تحریر کرے الفاظ کی سطح پر ہو یا مضامین کی اور صوفیانہ جذبات کو راہ نہ ملنے پائے اور شاعر مہذب دنیا کا فرد لگے اور اس کے جذبات ایک مہذب انسان کے جذبات ہوں۔ بشیر صرفی کے کلام کو پڑھتے ہوئے بھی تہذیبی سطح بر قرار رہتی ہے جیسے میر نے عشق کے بغیر نہ ہونے والی چیز قرار دیا تھا۔ بشیر صرفی کی شاعری عشق و محبت کے بدنی حصے سے زیادہ اس کی جذباتی حسیت سے معاملہ کرتی ہے۔ ان کے ہاں ابتدائے عشق کے معاملات سے زیادہ اس عہدِ جنون کی داستانیں ملتی ہیں جو غالباً ایک حادثے یعنی جدائی اور پھر محبوب کی بے اعتنائی کی کیفیات پر مبنی ہیں۔

قصد ترک سفر بھی کرلوں گا
شہر میں وہ کہیں دکھائی تو دے
میں جسے عرصہ ہستی میں ابد کر پاؤں
تم مرے واسطے وہ لمحہ اٹھا کے رکھنا
جانے کب ساعتِ ایجاب نگہ میں آئے
زیست ہے تیرے لیے ہاتھ اٹھا کے رکھنا

کہاں وہ بات کہ باتوں کی کوئی تھاہ نہ تھی
نگاہ تم سے ملی کیا کہ ہم بیاں سے گئے

بشیر صرفی کے نزدیک علاجِ غم لفظ، تسلی اور محبت کے لفظ جو جادو کا سا اثر رکھتے ہوں لہذا کہنے یا سننے کی صلاحیت ہو یا حرف تسلی لفظ کی وقعت و حرمت ان کے نزدیک بہت ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں:

مری تھکی ہو ئی آنکھوں پہ پھونک دو اک لفظ
نہیں ہے اور طلب عطا کر اک لفظ
علاج تیرہ نصیبی ہے اک حرفِ وفا
کسی بھی مول ملے مجھ کو لا دو اک لفظ

بشیر صرفی کے ہاں ایک غزل میں محبوب سے بڑی وارفتگی کا اظہار ملتا ہے کہ محبوب کا غم اگر ہو تو پھر کسی اور چیز کی پروا نہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

تمہارا غم ہو کہ غمِ روزگار ہو کے نہ ہو
ہو تم نظر میں شب انتظار ہو کے نہ ہو
یہاں وہ آئے جسے جاں دینا آتا ہو
یہ رسمِ مرگ ہے سر خود پہ بار ہو کے نہ ہو

انسانی زندگی کے مختلف ادوار کے مطابق ارتقائی تسلسل جاری رہتا ہے۔ شاعر عمر کے خاص حصے میں خالصتاً عشق و محبت کا اظہار کرتا ہے لیکن عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ اس کے موضوعات میں زندگی سے کشیدہ کردہ مشاہدات و تجربات کی پختگی اور وسعت بھی آجاتی ہے۔

نسیم سحر بشیر صرفی کے ہم عصر شعرا میں سے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں:

> بشیر صرفی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے اور غزل ہی ان کے اظہار کا پسندیدہ ترین وسیلہ تھی۔ غزل کے روایتی اور غیر روایتہً دونوں مضامین انھوں نے بڑے بھرپور انداز میں اپنے شعروں میں کامیابی کے ساتھ برتتے ہیں ان کی غزلوں کے مضامین

اور موضوعات اور الفاظ و تراکیب کے استعمال میں عمر کے مختلف ادوار میں نمایاں تبدیلیاں آتی رہیں جو کسی بھی تخلیق کار کے ارتقائی تسلسل کا ایک بین الثبوت ہوتا ہے۔ ذیل میں ان کی غزلوں کے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں جن سے میرا دعوی دلیل سے ہم آہنگ ہو گا۔"

ہوائے دہر کو تو اتنا مہرباں رکھنا
کہ مجھ پہ اپنی نگاہوں کا سائباں رکھنا

یہی بہت ہے کہ تم ساتھ چل رہی ہو میرے
طلسم ہے کہ سفر ہے مجھ کو بتانا مت

بند کمرے کی گھٹن میں کوئی کھڑکی ڈھونڈنا
اور تھک جائیں تو پھر دیوار کو در سوچنا

رہ جاؤ گے مٹی کی چادر تک سے محروم
کچے گھروں کے مکینوں کا سیلاب یہ کہتا ہے

ہم نہ اک عمر گریزاں ہوں گے
پھر بھی روشن یہ شبستاں ہوں گے

اک گہری خاموشی کو
گھر گھر چھوڑ گئی آندھی

بشیر صرفی نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہیں، ان کی نظموں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ یہ نظمیں غالباً ان کے عہد شباب کی عکاسی کرتی ہیں اور بشیر صرفی کے رومانوی مزاج کا پتا دیتی ہیں۔ بشیر صرفی کی یہ رومانویت محض عشق و محبت کی روایتی فضا تک محدود ہے، اس کو رومانوی تحریک سے منسلک نہیں کیا جا سکتا۔ "ملاقات پر ایک مکالمہ"، "اشتباہ" اور "کراچی یونیورسٹی" یہ بشیر صرفی کی ایسی نظمیں ہیں جن میں سادہ سے انداز میں عشق و محبت کی داستان بیان ہوئی ہے یہ غالباً ان کے عہد شباب کی عکاسی کرتی ہیں اور بشیر

صرفی کے رومانوی مزاج کا بھی پتا دیتی ہیں۔ بشیر صرفی کی یہ رومانیت محض عشق و محبت کی روایتی فضا تک محدود ہے اس کو رومانوی تحریک سے منسلک نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ملاقات پر ایک مکالمہ "میں بڑے فطری انداز میں محبوب سے بچھڑنے پر اپنے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں محبوب کے بچھڑنے سے جو کیفیت دل پر گذرتی ہے اس کا احوال بڑے خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں۔

میں ہنسنا بھول گیا تھا

تم سے بچھڑ کر

ہنسنا، زندہ رہنا بھول گیا تھا

قوس قزح کو شاموں کے سرمیلے پن

اور صبحوں کے روپہلے پن کو بھول گیا تھا

تم بچھڑے تھے جس گام پہ

اس سے آگے کوئی منظر صاف نہیں تھا

نظم "اشتباہ" میں بڑے روایتی انداز میں محبوب کے سندیسے کا انتظار ہے اور بڑی بے تابی سے ڈاکیے کی راہ دیکھی جاتی ہے مگر جب وہ عاشق کے گھر سے آگے نکل جاتا ہے تو گویا ساری امیدوں پہ پانی پھر جاتا ہے محبت میں ایسے لمحے بڑے مشکل، مضطرب اور صبر آزما ہوتے ہیں پھر دل میں وسوسے بھی پیدا ہوتے ہیں کہ ممکن ہے کہ محبوب نے کسی اور سے رسم و راہ بڑھالی ہو۔

مجھ کو امید تھی

آج خط آئے گا

کتنے دن کتنے ہفتے ہوئے

اس کی رنگین سندیسے کی امید نے

منتظر، مضطرب، صبر ناآشنا کر دیا

یہ بھی ممکن ہے خط اس نے لکھا تو ہو

حرفِ شریں اسے یاد ہے

اس کی باتوں میں پھولوں کی مہکار ہے

اس نے لکھا تو ہے

مگر ایڈریس اب

میرا نہ ہو

"کراچی یونیورسٹی" اس عنوان سے دو نظمیں ہیں پہلی نظم میں ماضی کے سنہرے دنوں کی یاد ہے کہ جب بشیر صرفی جامعہ یونیورسٹی میں صحافت میں ایم-اے کر رہے تھے زمانہ طالب علمی بے فکری اور لااُبالی پن کا زمانہ ہوتا ہے جس میں انسان زندگی کی پرپیچ راہوں سے ناواقف ہوتا ہے اور ذمہ داریوں کے بوجھ سے مبرا ہوتا ہے جس میں انسان قدم قدم پر خوابوں کی دنیا سے روشناس ہوتا ہے جب انسان زندگی کے اصل غم سے روشناس نہیں ہوتا اسے صرف ایک ہی غم ہوتا ہے اور وہی اس کی زندگی کا حاصل ہوتا ہے اس وقت جامعہ کی ہر ہر چیز بڑی دلکش لگتی ہے۔

اور تب جب کہ کچھ بھی نہ تھا اور سبھی کچھ میرے پاس تھا

جامعہ میں صحافت کے شعبے کے باہر

کسی لان میں، لائبریری میں یا کینٹین میں

ہر جگہ، ہر قدم، خواب ہی خواب تھے

خواب جو روشنی کی طرح نظر آتے تھے

"کراچی یونیورسٹی" ص۲۱۱

جیب سکوں سے خالی ہوتی تھی جو چائے کی پیالی سے زیادہ متحمل نہیں ہو سکتی تھی اور چائے کے بل کے بعد بس کے کرائے کی فکر ستاتی تھی اور تب

جب کہ کچھ بھی نہ تھا
اور سبھی کچھ میرے پاس تھا

"کراچی یونیورسٹی" ص ۲۱۲

"کراچی یونیورسٹی" کے عنوان سے دوسری نظم میں محبت کے سنہری دن اور پیڑوں کے نیچے بیٹھنا اور اس بات کی فکر کہ اب رفاقت کے یہ لمحے عارضی ہیں اور امتحانوں کو تھوڑے دن باقی ہیں بچھڑنے کا احساس اور خوابوں کے ٹوٹنے اور چراغوں کے بجھنے کا خوف دامن گیر ہے۔

امتحان میں بھی اب دن زیادہ نہیں
امتحان ہو چکے گا تو ہم تم بچھڑ جائیں گے
اپنی آنکھوں کے زر تار خواب اور روشن چراغ
سارے بجھ جائیں گے

"کراچی یونیورسٹی" ص ۲۱۳

بہار نو کی یہ امید دوسری نظم "بے سفر مسافر" میں سر بریدہ درختوں کی علامت کے طور پر نظر آتی ہے شاعر خود کو اور اپنے گروہ کو سر بریدہ درختوں کے مماثل قرار دیتا ہے ایسے درخت جن کی امیدوں کا نخل بھی سوکھ چکا ہے اس پر پتے نہیں آتے لیکن اس نخل کے لیے بھی واحد پناہ گاہ محبت کی آغوش ہے۔

اب جہاں میں کھڑا ہوں
وہاں اس زمیں اور سمندر کی ساری حدیں
تا بہ حدِ نظر
اک محبت کی آغوش کی چھاؤں ہے

"بے سفر مسافر"

"کراچی یونیورسٹی" کا یہ شعری اقتباس ملاحظہ ہو:

آؤ اس پیڑ کے نیچے کچھ دیر بیٹھ لیں

سمندر کی یہ نیم جان سی ہوا

ہم محبت کے ماروں سے احوال غم پوچھنے آئی ہے

دوسری طرف صحرا سے اس دھوپ میں اٹھنے والے بگولے

ادھر جامہ کی فصیلوں سے ٹکرا کے واپس ہوئے

اب ذرا امن ہے

کلام معلق میں شامل ایک نظم جو ترجمہ ہے اور ''ترجمہ'' کے عنوان سے ہی شامل کلام ہے اس نظم میں روایتی عشقیہ موضوع بیان کیا گیا ہے اور محبوب پر اپنا سب کچھ لٹانے کا اظہار کیا گیا ہے

تیری راہ میں پھول بکھیروں

آؤ میرے پھولوں کے راجا

آؤ میں اپنا حال سناوں

دل ہے غم سے چاک دکھاوں

میں دکھیاری دل بہایا جا

آؤ میرے پھولوں کے راجا

پیار کے پھول چنیں کے ہم تم

پیار بنا جینا بے کار

توہی میری آس ہے ورنہ

جیون دو دھار ی تلوار

''نقش اول'' کے نام سے شامل نظم خالصتاً عشق و محبت اور اس سے متعلقہ احساسات و جذبات کی ترجمان ہے یہاں شاعر کی توجہ کا مرکز و محور محبوب ہی ہے۔ نظم کا اقتباس ملاحظہ ہو:

دبے لفظوں کی توقیر بھی تم، مرے شعروں کی تفسیر بھی تم

مرا خواب بھی تم اور خوابوں کی تعبیر بھی تم

مرے جذبوں کی سچائی کا عنوان بھی تم

تم ساز بھی ہو تم نغمہ بھی

تم رنگ بھی ہو تصویر بھی تم

بشیر صرفی کے کلام متروک میں بھی جو غزل شامل ہیں اس میں عصری حسیت کے ساتھ عشق کا روایتی موضوع ملتا ہے۔ غزل کی کلاسیکی روایت اور اس کے موضوعات میں سے عشق کا موضوع اسی انداز سے ملتا ہے جیسا کہ کلاسیکی غزل میں بیان ہوا ہے:

تمہاری دید کی گر ہم کو تشنگی نہ لگے

تو اپنا آپ بھی اپنا ہمیں کبھی نہ لگے

بجھا گیا ہے امیدیں وہ رشک ماہ رخاں

ہے اس کے بعد شب ہجر اور رشک دواں

غم فراق سے اک آگ سی بھڑکتی تھی

ہم آب جو کے کنارے تھے سوختہ ساماں

اور اس عشق کے موضوع کے بیان میں ایک جگہ محبوب کا ذکر مونث کے صیغے میں ملتا ہے جو کہ جدید غزل میں برتا جاتا ہے۔

تاثیر اس طرح کی تھی اس کے کلام میں

خوش بو اتر رہی تھی بدن کے شام میں

وہ بام پر شفق کی طرح جلوہ ریز تھی

جیسے طلوع ماہ منور ہو شام میں

مجموعی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ بشیر صرفی کے ہاں عشق و محبت کا موضوع روایت کے تسلسل کا ایک حصہ ہے یہ موضوع ان کی شاعری کا کوئی غالب رجحان نہیں ہے ان کی شاعری میں غالب رجحان اپنے عہد کے حالات ہیں۔

ج) بشیر صرفی کی شاعری میں سماجی رومانویت:

بشیر صرفی کی بنیادی خصوصیات یہ ہے کہ ان کا کلام روایت سے جڑت کا حامل بھی ہے اور جدید عصری تقاضوں کا بھرپور احساس بھی نمایاں ہے۔ بشیر صرفی کے ہاں حالات کے تناظر میں سماجی و معاشرتی سطح پر ایک بے چینی، اضطراب کی کیفیت مایوسی، تنہائی خوابوں کی شکستگی، خوابوں کی بنت، صبح نو کی امید، غم والم، ماضی پرستی اور یاد جیسے موضوعات در آئے جس سے ان کی شاعری میں وہ پہلو ابھر کر سامنے آئے، جنھیں ہم سماجی رومانویت کا نام دیتے ہیں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ بشیر صرفی کا رومانویت سے تعلق اپنے ہم عصر شعرا سے اثر قبول کرنے اور روایت کی حد تک ہے۔ بہر حال کوئی بھی شاعر ان سماجی رومانوی عناصر سے اپنا دامن نہیں بچا سکتا ہے یہ رویے سماج میں موجود ہیں اور انسان ان کا اظہار فطری ونفسیاتی سطح پر ضرور کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو قیام پاکستان سے اب تک شاعری ترقی کی منازل طے کرتی آئی ہے اردو شاعری بالخصوص غزل میں فنی و فکری سطح پر موضوع اور ہئیت کے حوالے سے تجربات کیے گئے یہی وجہ ہے ہماری شاعری میں عشقیہ جذبات، نازک احساسات سے لے کر حیات و کائنات کے تماتر مسائل کو شعرا نے اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ بشیر صرفی کی شاعری میں بنیادی طور پر غزل کا ڈھانچہ بھی انہی بنیادوں پر استوار ہے۔

ڈاکٹر صلاح الدین درویش بیان کرتے ہیں:

> غزل ہماری تہذیبی زندگی کا جمالیاتی اظہار ہے حیات و کائنات کے وہ تمام مظاہر جو چشم تماشا سے گزرتے ہیں غزل کا شاعر اپنے جذبہ واحساس کو کام میں لاتے ہوئے اپنی شاعری میں ان کی سماجی معنویت اور قدر کا تعین کرتا ہے یوں غزل کا شعر ایک سطح پر کسی واقعے یا معاملے یا کسی منظر کی تصویر کشی کرتا جبکہ دوسری سطح پر اس وقوعے، معاملے یا منظر کے حوالے سے اپنے نقطہ نظر کو بیان کر دیتا ہے۔ بشیر صرفی کی غزل میں ان دونوں سطحوں کا کمال ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ اگر ایک طرف زیست کا کمال ہے تو دوسری طرف اس معاملے سے متعلق اپنے فہم کا اظہار بھی ہے یوں غزل

کے دونوں مصرعے مل کر جس بیانیے کو سامنے لاتے ہیں وہ دعوت فکر کو مہمیز دیتے ہیں۔[۸]

فکر دروازہ کو در کیا کرتے
ہم مسافر تھے تو گھر کیا کرتے

بشیر صرفی کی غزلیات کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ غزل نہیں کہہ رہے بلکہ اپنے ذاتی حالات و شب و روز بیان کر رہے ہیں ان کے اِن جذبات اور اظہار میں روانی ہے جس میں تکلف کا مادہ کم ہے اور یہی چیز ہمیں بشیر صرفی کو گہرائی میں جا کر مطالعے کی طرف راغب کرتی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری یا کلام ہر شاعر کی انفرادی فکر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ بشیر صرفی کا کلام بھی زندگی کے حقائق کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے باطن کا بھی عکاس ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کے دکھ اور مصائب محض ذاتی نہیں رہے سماجی سطح پر وہ قاری کو اپنا غم لگنے لگے ہیں گویا داخلی کیفیات کے عکاس بھی تھے۔

اجنبیت ہے بعد کا قصہ
پہلے وہ کربِ آشنائی تو دے
ڈھونڈلوں گا میں اپنے آپ کو بھی
تو مگر قید رہائی تو دے
جوشِ وحشت سے دامنِ دل بھی گیا
ہو گیا تار تار سونے دے
کُو بہ کُو چھا گیا سناٹا
ہجر ہے غم گسار سونے دے

بشیر کی صرفی شاعری میں جدت کے باوجود کلاسیکی روایت سے مکمل طور پر ناطہ توڑنا پسند نہیں کرتے ان کے ہاں روایت تہذیبی رکھ رکھاؤ اور کلاسیکی اساتذہ کی پیروی کرتے ہوئے نہ صرف روایت کے استحکام کی

کوشش ہے بلکہ روایت کے اندر سے راہ نکالتے ہیں ان کی غزلوں کا کلاسیکی رچاؤ معنی و مفاہیم اور الفاظ کے اعتبار سے ان کی غزلوں میں نظر آتا ہے۔

سوا نہ کوئی اس سے زیست کا حساب ملا
مجھے تو آنکھوں میں تمھارا خواب ملا

گو کہ بشیر صرفی کے ہاں عصری شعور کا ادراک ہے مگر وہ اپنے عہد کے سماجی حالات و واقعات، جمالیات اور مذہبی عقائد سے فرار حاصل نہیں کرتے۔ مذہبی حوالے سے وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے جبکہ سماجی و ادبی حدود کے اندر رہتے ہوئے جدت کا انداز بھی اختیار کیا لیکن انھوں نے شعوری طور پر ایسا شعری نظام ترتیب دیا کہ سماجی سطح پر رومانویت کا اظہار ان کے کلام میں ایک واضح سعی کے طور پر نظر آتا ہے۔

اب کڑی منزل ہے امید کی چھتری تان لیں
راستے کی دھول سر پر آسماں ہونے کو ہے

انداز کی جدت کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو:

دیکھ کے اس بستی کے منظر ڈر سا لگتا ہے
فلک کے ٹوٹ کر گرنے کا دھڑکا سا رہتا ہے
رہ جاؤ کے مٹی کی چادر تک سے محروم
کچے گھروں کے مکینوں کو سیلاب یہ کہتا ہے

بشیر صرفی کی شاعری کا فکری و موضوعاتی دائرہ اہمیت کا حامل ہے۔ اُن کا طرزِ احساس ذات وحیات اور کائنات کے مسائل کو اپنے اندر سمیٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اُن کی شاعری کے مجموعی لہجے پر اداسی ہے مگر مذہب سے وابستگی کی بنا پر قنوطیت کا رنگ نہیں یہی چیز مسائل سے نبرد آزما ہونے میں انھیں سماجی رومانویت کی طرف لے جاتی ہے بشیر صرفی کی شاعری کے اس پہلو کے بارے میں ڈاکٹر شفیق انجم بیان کرتے ہیں:

بشیر صرفی کی غزلیہ شاعری میں عشق، غمِ ہجراں، تنہائی، انتظار اور یاد کے لہرے بار بار بنتے اور مختلف صورتوں میں ڈھل کر اپنا اظہار پاتے ہیں ان لہریوں کے ساتھ برداشت عزم و حوصلہ اور سہار سنبھال کا بہاؤ بھی ہے۔ یہیں کہیں ضبط کے بندھن

ٹوٹ جانے اور رات کی خاموشیوں میں آبجوئے اشک کے رواں دواں ہو جانے کے مظہر بھی ہیں بشیر صرفی اسی گھماؤ میں اتر کر اپنا آپ لکھتے ہیں کرب کے بھنور، کبھی ذات سے نکل کر کبھی ذات میں گم ہو جاتے ہیں کبھی عصری ماحول سے ابھر کر مختلف سمتوں میں پھیلتے سمٹتے اور کبھی کائنات کے بسیط حوالوں سے گھوم شاعر کے تخلیقی باطن میں آپڑاؤ کرتے ہیں۔[۹]

ٹوٹتا جب بدن تو گھر ہوتا

میں نہ یوں نقش رہ گزر ہوتا

پھول پھل اور شجر ، ی ہ ھارا ہے

میرا ہوتا جو بے ثمر ہوتا

کوئی بھی حساس انسان نہ صرف اپنی ذات کے اندر ہونے والے معاملات سے باخبر ہوتا ہے بلکہ سماجی سطح پر ہونے والے معاملات سے بھی آگاہی رکھتا ہے۔ شاعر معاشرے کا حساس انسان ہوتا ہے وہ نہ صرف سماجی حقائق کا گواہ ہوتا ہے بلکہ ان کے حوالے سے رد عمل بھی ظاہر کرتا ہے۔ شاعر کے گرد و پیش کے واقعات اس کے ذہن کو متاثر کرتے ہیں اردو شاعری میں سماجی شعور شروع سے ہی ادب کا حصہ رہا ہے انسانی رویوں کی بدصورتی شدت سے محسوس ہوتی ہے معاشرے میں بے حسی جیسے رویے شعرا کو رد عمل پر مجبور کرتے ہیں۔

محفل میں کوئی آنکھیں کھولے سناٹا سا پائے

سب اپنے اپنے دھیان میں گم ہیں اٹھ کر تاریکی کر دو

میرے اجڑنے سے گر بستے ہو تم بس جاؤ

اپنا گھر آباد کرلو میرا غم نہ کرو

بشیر صرفی کی منظومات میں بھی جدید عہد کے مسائل کے باعث دھندلکے تیرگی، جھوٹ، منافقت، مصنوعی پن، رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ جسے سماجی عناصر ان کو اندر سے دباؤ کا شکار کرتے ہیں۔ بشیر صرفی خود

ایک وضع دار انسان تھے یہ مسائل ان کی شاعری میں سماجی رومانویت کا باعث بنے ان مسائل سے باہر نکلنے کی کوشش ہے۔

نظم ''ریسٹ ہاؤس کی ایک شام'' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

اب یہ سوچا ہے کہیں دور چلوں

جہاں شب تاب تمنا تیرا پیکر بن جائے

جہاں ہر عہد بنے عہد وفا

جہاں ہر رنگ تمنا تیرے سانچے میں ڈھلے

ریسٹ ہاؤس کی شام

ان مسائل سے راہ فرار کی کوشش ایک رجائی نقطہ نظر ہے لیکن اس کے بعد ان دیکھے خدشات اُن کو دوبارہ گھیر لیتے ہیں پھر شام، جدائی، اداسی، خزاں، دھواں اور افسردہ آنکھیں جیسے الفاظ ان کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔ آخر میں بڑی حوصلہ مندی سے یہ کہتے ہیں۔

چپ، خزاں، شام، دھواں اور فسردہ آنکھیں
لاکھ دل کش ہی سہی، منظر یہ کبھی تو بدلے

''ریسٹ ہاؤس کی ایک شام'' ص۲۰۵

i۔ آدرش اور خواب:

بشیر صرفی کا دور ہر لحاظ سے مسائل اور مصائب کا دور تھا جس کی وجہ سے ان کے ہاں دکھ، تکلیف، تنہائی، احساس زیاں، کڑواہٹ، خوف، ڈر اور جبر کا احساس جیسے موضوعات در آئے لیکن باوجود ان تمام تر مصائب کا ادراک رکھنے کے ان کے ہاں بلا کی حوصلہ مندی ہے وہ مصائب سے گھبرانے کے بجائے زندگی کی ٹھوس حقیقت مان کر ان کا سامنا کرتے ہیں۔ بشیر صرفی کی زندگی ایک کھرے انسان کی زندگی تھی لہٰذا ان کی مذہبی شاعری، کشمیر کاز کے لیے لکھی گئی شاعری کے علاوہ ان کی غزلیات میں بھی لہجے کا عزم جھلکتا

ہے اور روشن صبح کا انتظار بشیر صرفی کے لیے سرمایہ حیات ہے۔یہی خواب اور آدرش ان کی شاعری کی انفردیت اور جاذبیت کا باعث ہیں۔

بشیر صرفی کی شاعری میں امید و نا امیدی کا بھی حسین امتزاج ملتا ہے درد و غم کے ذکر سے بعض اوقات لگتا ہے کہ بشیر صرفی وصل سے نا امید ہو گئے ہیں۔ایسے میں اُن کے ہاں شکوہ و شکایت نظر آتا ہے مگر ساتھ ہی دل میں موہوم سی امید ایک آس کا رشتہ ہمیشہ بندھا رہتا ہے اس کو بشیر صرفی نے کبھی ٹوٹنے نہیں دیا۔یاس و امید کا عجیب تعلق ان کی شاعری میں نمایاں ہے:

شمع کی طرح بجھ گئی امید
کرب ہے بے کنار سونے دو
جب در یچوں سے نئی ہو ا آئے گی
اپنی خوشبو کو ذرا ساتھ ہو ا کے رکھنا
دل دریدہ ہے مگر کوئی پناہ گائیں نہیں
پھول امیدوں کے بھی سنگ سزا کیوں ہو گئے

فارسی الفاظ و تراکیب اور روایتی مضامین کے بیان کا روایتی انداز بھی بشیر صرفی کے ہاں ملتا ہے۔ روایتی مضامین کی ایک اہم مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو۔

سوا نہ کوئی اس سے زیست کا حساب ملا
مجھے تو جاگتی آنکھوں [illegible] ھارا خواب ملا

چاند اگرچہ روایتی اردو شاعری میں مستقل موضوع کے طور پر موجود رہا ہے اور اسے محبوب کے چہرے سے [illegible] دی جاتی رہی یا تنہا راتوں کا مونس و غم خوار مگر چاند کی بطور چراغ حیثیت پر شعرا نے بہت کم لکھا لیکن بشیر صرفی کے ہاں چاند کہیں پر روشنی اور نور کا وہ وسیلہ ہے جس کی عدم موجودگی کا تصور ہی خوفناک ہے۔

تیرگی رات کی ہولا دیتی
چاند ہوتا نہ گر کیا کرتے

یہی چاند امکان سحر پر چشم نم سے اسے دیکھتا بھی ہے۔

پس شب اب جو امکان سحر ہے
یہ ڈھلتے چاند کی تو چشم تر ہے

کہیں یہ چاند ان کو اپنے ہی جیسے نصیب کا حامل لگتا ہے وہ رقمطراز ہیں۔

زمیں پہ میں بھی ہوں دونیم آخر شب
فلک پہ چاند بھی اپنے زوال میں ہوگا

اور کہیں بالکل اچھوتی صورتحال ہوتی ہے اور چاند لینڈ اسکیپ کا حصہ بن جاتا ہے۔

نہ جانے صحن کی دیوارپر ہے کب سے چاند
قدم بڑھا کے یہ حد پار کیوں نہیں کرتا

بشیر صرفی کے ہاں جدید الفاظ وتشبیہات میں بھی ایک خاص طرح کی امیجری نظر آتی ہے جو انسانی ذہن کی آنکھ سے ایک منظر بناتی ہے جو بہت واضح ہوتا ہے۔اسی خصوصیت کے حامل دواشعار کا اقتباس ملاحظہ ہوں۔

کُوبہ کُو منزل بہ منزل یوں سدا پھرتا ہوا
جیسے میں پتھر تھا ایک ڈھلوان سے لڑھکا ہوا
جیسے آنسو آنکھ سے گر کر ملا ہو خاک میں
اور تنہا زرد پتا جھیل میں ٹھہرا ہوا
رنگ آنکھوں میں بہت اس کے سجا کے رکھنا
نقش ہجراں بھی مگر دل میں بسا کے رکھنا

بشیر صرفی جدید انسان کی تمام تر شکست وریخب ی کے باوجود مایوس نہیں ہوتے زندگی اور اس کی بے چہرگی کا شکوہ ضرور کرتے ہیں مگر آمد بہار کے خواب دیکھنے سے گریزاں نہیں ہیں وہ اپنے جذبات پر کوئی قدغن

نہیں لگاتے وہ محسوس کرتے ہیں کہ بہار کی آمد سے اندھیروں کا سفر ختم ہوا وہ تمام لمحے جو طوق سزا بنے تھے آب بقا کے کنارے اب کھڑے تشنگی بجا رہے ہیں۔

اب عکس آئینہ عکس جاں ہے
یہ عکس جاں ہے شناخت اپنی
کہ دور بے چہرگی کا باب
آخر بھی ڈھے گیا ہے
چلو میرا ہاتھ تھامو
کہ صبح دلشاد آرہی ہے

"آمد بہار" ص۲۰۷

بشیر صرفی کے ہاں یہ نقطہ بڑا حوصلہ افزا ہے کہ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں صبح کا خواب ضرور دیکھتے ہیں۔بشیر صرفی جب کراچی یونیورسٹی میں صحافت میں ایم۔اے کر رہے تھے تو "کراچی یونیورسٹی" کے عنوان سے انہوں سے ایک نظم لکھی جس میں خوابوں کے ٹوٹنے اور بکھیرنے کا خدشہ انہیں لاحق ہے۔زمانہ طالب علمی بے فکری اور لاابالی پن کا دور ہوتا ہے جس میں انسان زندگی کی کٹھنائیوں سے واقف نہیں ہوتا تو قدم قدم پر خوابوں کی دنیا سے روشناس ہوتا ہے اسے غم سے کوئی سابقہ نہیں ہوتا ہے وہ خواب بُنتا ہے اور یہی خواب اس کی زندگی کا حاصل ہوتے ہیں اسے اپنی یونیورسٹی کی ہر چیز بڑی دلکش نظر آتی ہے۔

اور تب جب کہ کچھ بھی نہ تھا اور سبھی کچھ میرے پاس تھا
جامعہ میں صحافت کے شعبے کے باہر
کسی لان میں، لائبریری میں یا کینٹین میں
ہر جگہ، ہر قدم، خواب ہی خواب تھے
خواب جو روشنی کی طرح نظر آتے تھے

"کراچی یونیورسٹی" ص۲۱۱

"کراچی یونیورسٹی" کے عنوان سے دوسری نظم میں محبت کے سنہری دن اور پیڑوں کے نیچے بیٹھنا اور اس بات کی فکر کہ اب رفاقت کے یہ لمحے عارضی ہیں اور امتحانوں کو تھوڑے دن باقی ہیں بچھڑنے کا احساس اور خوابوں کے ٹوٹنے اور چراغوں کے بجھنے کا خوف دامن گیر ہے۔

امتحان میں بھی اب دن زیادہ نہیں
امتحان ہو چکے گا تو ہم تم بچھڑ جائیں گے
اپنی آنکھوں کے زر تار خواب اور روشن چراغ
سارے بجھ جائیں گے

"کراچی یونیورسٹی" ص۲۱۳

بعض اوقات بشیر صرفی خواب دیکھتے ہوئے خود ہی کسی منظر کا حصہ ہی بن جاتے ہیں وہ طلوعِ صبح کا منظر ہو یا غروب آفتاب کا انھیں ہر چہرہ اچھا لگتا ہے اور ہر بات اچھی لگتی ہے۔ حسن جس رنگ جس جہت میں ہو وہ اس کا ادراک اور احساس رکھتے ہیں خود کو ہر حسین شے سے نسبت کا حامل قرار دیتے ہوئے اپنی نظم "منظر کی تیسری جہت" میں رقم طراز ہیں:

سورج، چاند، ستارے، کلیاں، پھول
ساتوں سر سرگم کے، کومل، تیور کے سب روپ ہنستے
چہرے، شاعری، رقص، کتابیں، سب فن پارے
اچھی قدریں، سارے اجلے اجلے منظر
آنکھوں روشنیوں کے کھلے دریچے
ننھے ننھے بچے اور ان کی کوملتا ساری
جو منظر بھی سامنے آئے دل میں رچ بس جاتا ہے
چاند سے اجلے چہروں پہ مر مٹنے کو جی چاہتا ہے

"منظر کی تیسری جہت" ص۲۱۶

اس نظم کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ شاعر ان تمام خوب صورت مظاہر کا حصہ اس وقت بنتا ہے جب غروب آفتاب بے چہرگی کے سفر میں اعلیٰ اقدار کو ذریعہ نجات مانتا ۔ اور ان سے وابستگی کو اس اندھیرے کے خاتمے کی دلیل قرار دیتے ہوئے ان کا حصہ بن کر ایک نئی امید سے روشناس کرواتا ہے اور اُجلے اُجلے خوابوں کو اپنے ہاں بسالیتا ہے۔بشیر صرفی اپنے عہد اور اندر کی تیر گی کا مقابلہ فطرت اور خوابوں کی سبب سے کرتے ہیں اس جذبے کی عکاسی ان کی نظم "حد نظر میں" ملتی ہے۔

سوچتا ہوں کہ نئی فکر کا پیکر بن کر
اپنے ٹوٹے ہوئے آئینے کی کرچیں لے کر
اپنے غم خانے سے مہتاب ابھاروں کوئی
اپنی محرومی کا احساس کبھی تو رد ہو
جب میری حد نظر روشنیوں کی حد ہو

بشیر صرفی کی بیشتر نظموں میں حرماں نصیبی، مایوسی اور بدحالی کا احساس ملتا ہے لیکن اس کے ساتھ پھر سے زندگی جینے کا حوصلہ اور مظاہر فطرت کی مدد سے نئے خواب بنتے ہیں جو تیرگی کو ختم کر کے حد نظر روشنیوں کو ان تک لے آتے ہیں۔ نظم "آدھی رات" کا درد بشیر صرفی کی رجائیت سے بھرپور شاعری کی مثال ہے "آدھی رات" اندھیرے کے گہرے ہو جانے کی علامت ہے وہیں صبح سے مساوی فاصلے کی امید بھی ہے گویا آدھی رات کا سفر روشنی سے قربت کے بڑھنے کا سفر ہے۔

صبح خنداں کی طلب چشم کو گرماتی ہے
کوئی بھٹکی سی کرن تیزانی کی مانند
دور تک دل میں اتر آئی ہے
چند لمحوں کو میرے مرگھٹ سے
میری بد روح نکل جاتی ہے

"آدھی رات کا درد" ص ۲۳۴

مزید کہتے ہیں:

اور کچھ دیر میں چھٹ جائیں گے کالے بادل
اس اداسی کا منوں ٹوٹے گا
سینکڑوں روٹھے ہوئے لمحے پلٹ آئیں گے
کافی صدیوں کا غضب ناک اندھیرا ڈر کر
میرے ادراک کی سرحد سے نکل بھاگے گا
جگمگائے گا مری روح کا کالا پاتال

"آدھی رات کا درد" ص ۲۳۴

کشمیری مجاہدین اور نوجوان اپنے وطن کو آزادی دلانے کے لیے کوشاں ہیں۔بشیر صرفی بھی اپنے وطن کی آزادی کا خواب سالوں سے دل میں بسائے ہوئے تھے۔وہ بہت پر امید تھے کہ کبھی شہدا کی قربانیوں کا خون رنگ لائے گا۔اپنی نظم "صبح آزادی" میں آزادی کی خوشخبری سناتے ہیں۔

اب خون کی خوشبو بولے گی
اب ظلم کی کشتی ڈھولے گی
تاریخ یہ باب بھی کھولے گی
اب آنکھیں منظر لوٹیں گی
جذبوں سے بہاریں پھوٹیں گی
لو ظلم کا قانون گیا
ابلیس کا ہر مضمون گیا
نمرود گیا --- قارون گیا

"صبح آزادی" ص ۲۸۴

امید انسان کو زندگی گزارنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ ہر کشمیری شہری کی طرح بشیر صرفی نے کشمیر کی آزادی کا خواب دیکھا ہے ان کا عزم و حوصلہ جوان ہے ان کو یقین ہے کہ کشمیر بالآخر آزاد ہو کر رہے گا۔ ان کی نظم "نغمہ آزادی" کا شعر ملاحظہ ہو۔

مرے کشمیر کو اب بالیقین آزاد ہونا ہے
سکون نا آشنا وادی کو پھر سے شاد ہونا ہے
اسے اک قوم اب اقوامِ عالم میں بنانا ہے
مری آواز دل کو ی بیسیہ یر فرہاد ہونا ہے
سجانا ہے ہمیں کشمیر کا ہر گوشہ و قریہ
وطن کا نقش رشک مانی و بہزاد ہونا ہے
زمانہ اس کی خوشبو سے مہک جائے گا پھر وانی
شہیدوں کے لہو سے اک چمن ایجاد ہونا ہے

"نغمہ آزادی" ص۲۵۵

بشیر صرفی کے کلام معلق میں بھی باوجود حالات کی سنگینی کے امید اور رجائی نقطہ نظر نمایاں ہے۔ وہ اچھے دنوں کے خواب بنتے ہیں تہی دامن ہونے کے باوجود وہ اچھے دنوں کا خواب ضرور دیکھتے ہیں کہ کبھی یہ وقت بدلے گا یہی حوصلہ امید ان کی شاعری کا نمایاں وصف ہے:

ٹوٹے شجر سے برگ، ہوا ہم رکاب ہے
اہل سفر کے ولولے کیا جاں فزا سے ہیں
دل کی تاریکی میں پھوٹے گی کبھی کوئی کرن
گرچہ اپنے آپ کو مجھ سے جدا تم نے کیا
وہ ایک حرف وفا، حرف آشنا نہ ہوا
وگرنہ جانِ جہاں اور تم سے کیا نہ ہوا

تمام عمر مرے ہاتھ اگرچہ آ نہ سکا
کبھی بھی دامن امید سے جدا نہ ہوا

ماضی پرستی/ناسٹلجیا:

بیتے دنوں کی یاد انسانی زندگی کا سرمایہ ہوتی ہے۔انسان کہیں بھی چلا جائے اپنے ماضی سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ماضی کی یادیں حسین ہوں یا تلخ انسان کو تڑپاتی ضرور ہیں۔شاعر حضرات سب سے حساس طبقہ ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں بیشتر شعرا ماضی کی یادوں سے دامن نہیں چھڑا سکے۔ماضی پرستی انسانی فطرت نہ سہی اس کا ایک حصہ ضرور ہے ناصر کاظمی کا نام اس ضمن میں اہمیت کا حامل ہے۔

بشیر صرفی کا تعلق کشمیر سے تھا وہ کشمیر سے ہجرت کر کے راولپنڈی آئے پھر پاکستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات دِگرگوں تھے۔بشیر صرفی کی نجی زندگی بھی مشکلات کا شکار تھی حالات سے تنگ آ کر ماضی پرستی کا رجحان رکھنے کو فرار کی شکل میں تسلیم کرتا ہوا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

پلٹ کے بیتے دنوں میں پہنچنا چاہتا ہوں
وہ اپنے آپ سے کیسے فرار مانگتا ہے

کلامِ متروک میں بھی انہی دلگداز اور پر سوز جذبوں کا ذکر کرتے ہیں:

ٹوٹتا جب بدن تو گھر ہوتا
میں نہ یوں نقش رہ گزر ہوتا

بشیر صرفی کو محبوب کی یاد تڑپاتی ہے تو یہ یاد اس کو محبوب کے پرانے گھر کی طرف لے جاتی ہے اس کے گلی کوچوں میں تسکین ملتی ہے۔

اب کے وہ آئی تو پیغام شفا دے جائے گی
تشنہ دیوار کو آب بقا دے جائے گی

بشیر صرفی کی حوصلہ مندی یہ ہے کہ گزرے وقتوں کی یاد اُن کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔ انھوں نے غم، تنہائی اور یاد کا لطف جس طرح اپنی شاعری میں دکھایا ہے وہ کمال کی انتہا کو چھوتا ہے۔ یہ چیزیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان پر بوجھ نہیں بلکہ وہ ان سے حظ کشید کرتے ہیں وہ اپنا درد و غم کمال حوصلے اور جرات سے دوسروں کے سامنے لاتے ہیں اپنے مشاہدات و محسوسات اور تجربات اور داخلی مکالمے کو کسی دوسرے کے دل کی آواز بنانا بذاتِ خود بڑی ہمت اور جرات کا متقاضی ہے یہی چیز ہمیں بشیر صرفی کی غزل کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

مرے وجود میں تو اس طرح بھی زندہ ہے
دریدہ جسم پہ تیرا رفو ابھی تک ہے

اپنی نظم ''نارسیدہ'' میں بھی پرانی لطافتوں کو یاد کرتے ہوئے ناکسی کو عذاب کہتے ہیں۔

یہ ناکسی کا عذاب کیا ہے
تلاش کرتی ہے فصل گل اب لطافتوں کو
خزاں تو اپنا نصیب ٹھہرا
بہت سے بے رنگ موسموں کی
کڑی گرفتوں میں ہڈیاں تک چٹخ رہی ہیں

''نارسیدہ'' ص ۲۰۱

''کراچی یونیورسٹی'' کے عنوان سے بشیر صرفی کی دو نظمیں ہیں پہلی نظم میں ماضی کے سنہرے دنوں کی یاد ہے کہ جب بشیر صرفی جامعہ میں صحافت میں ایم-اے کے طالب علم تھے یہ دور بے فکری اور لاپروائی کا دور ہوتا ہے جس میں انسان عملی زندگی کی راہوں سے نابلد ہوتا ہے ایسے میں ماضی کے یہی سنہرے دن انسان کا سرمایہ حیات ہوتے ہیں۔ بشیر صرفی کہتے ہیں کہ میرے پاس اس وقت کچھ نہیں تھا مگر کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ میرے پاس تھا۔

اور تب جب کہ کچھ بھی نہ تھا اور سبھی کچھ میرے پاس تھا

جامعہ میں صحافت کے شعبے کے باہر

کسی لان میں، لائبریری میں یا کینٹین میں

ہر جگہ، ہر قدم، خواب ہی خواب تھے

خواب جو روشنی کی طرح نظر آتے تھے

"کراچی یونیورسٹی" ص۲۱۱

اسی نظم کا مزید اقتباس ملاحظہ ہو:

جب کچھ بھی نہ تھا

اور تب جیب میں چند سکے کہ جو

چائے کی دو پیالی سے زیادہ کسی چیز کے متحمل ہی نہ تھے

چائے کی پیالیاں اور بہت دیر تک گفتگو

گفتگو، قہقہے، گفتگو

پھر اچانک بہت دیر بعد اک خلجان نیا

چائے کا بل ادا ہو تو بس کا کرایہ کہاں سے کریں

اور تب

جب کہ کچھ بھی نہ تھا اور سبھی کچھ میرے پاس تھا

اسی عنوان سے دوسری نظم میں بھی محبت کے سنہرے دنوں کی یاد کا احساس نمایاں ہے کہ بچھڑے ہوئے لمحے مستقبل میں خوبصورت یادیں بن کر ہمارا تعاقب کریں گے۔ نظم "دسمبر کی آخری رات" میں بھی بچھڑ جانے والے یار دوستوں کی صحبتوں کی یادوں کو تازہ کرتے ہیں گویا بشیر صرفی اپنی یادوں میں بچھڑے ہوئے دوستوں کا تذکرہ کر کے ایک جشن برپا کرنا چاہتے ہیں جو ایک مثبت پہلو ہے۔

آوارہ اشکوں کو گوہر کریں اور پھر
طشتِ دل میں سجا کر دسمبر کی اس آخری رات میں
یوں اچھالیں کہ یارانِ رفتہ کی یادیں منور کریں
ان کو آواز دیں، جشن برپا کریں

"دسمبر کی آخری رات"ص ۲۲۴

ڈاکٹر شفیق انجم "کلامِ بشیر صرفی" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

بشیر صرفی کے لب و لہجے میں بلا کی حوصلہ مندی ہے۔ غمِ ذات و حیات کو انھوں نے عمر بھر اوڑھے رکھا جو واضح طور پر دکھائی دیتا ہے کہ غم ان کے نزدیک لطفِ زندگی ہے تنہائی ان کی دوست بیتے دنوں کی یاد ان کا سرمایہ اور ایک روشن صبح کا انتظار ان کا ایمان ہے وہ ایک اصول پسند انسان کی زندگی جینے اور منافقہ وں کے عہد میں سچائیوں کا دم بھرتے رہے یہ آسان کام نہیں تھا۔[۱]

بشیر صرفی کے ہاں گزرے ہوئے لمحوں کو واپس لانے کا عزم موجود ہے۔ نظم "آدھی رات کا درد" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

اور کچھ دیر میں چھٹ جائیں گے کالے بادل
اس اداسی کا منوں ٹوٹے گا
سینکڑوں روٹھے ہوئے لمحے پلٹ آئیں گے

گویا بشیر صرفی کے ہاں روایتی مضامین کے ساتھ غزل کے موضوعات تنہائی، کرب، دکھ، احساس زیاں، بے وقعتی، جیسے موضوعات کا بیان ملتا ہے۔ وہ ان مناظر، ان محفلوں اور ان یادوں کے اسیر نظر آتے ہیں جو ان کے ماضی کا حصہ ہیں اس کے ساتھ ساتھ رجائی نقطہ نظر بھی ہے۔ وہ نئے زمانے، نئے تقاضوں اور نئے مسائل کا شعور بھی رکھتے ہیں۔

iii۔ آلام وروز گار:

انسان کی زندگی دو بنیادی جذبوں سے عبارت ہے ایک خوشی اور دوسرا غم، زندگی گزارنے کے لیے انسان کو دونوں جذبوں کا مزہ چکھنا پڑتا ہے۔ انسان کو خوشی کے لمحات مختصر لگتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ غم کے لمحے طویل اور بھاری لگتے ہیں۔ اردو شعرا نے غم کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک غمِ عشق اور ایک غمِ دوراں، غمِ عشق میں بھی دکھ درد سہنا پڑتا ہے مگر اس کا احساس بہت لطیف ہوتا ہے جبکہ غمِ دوارں کا احساس شدید ہوتا ہے۔ غمِ روزگار میں وقت اور حالات کے تناظر میں تمام دردو غم اور تکالیف شامل ہیں۔ مثلاً اپنے عہد کا غم، تنہائی، انتظار، جبر، خوف، ڈر، مظلومیت یہ سب شامل ہیں۔

اردو شاعری کی تاریخ میں بھی تمام شعرا غمِ روزگار کا رونا روتے ہیں۔ بشیر صرفی کی شاعری کا ایک حصہ آلام وروز گار پر مبنی ہے جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ بشیر صرفی کا عہد سقوطِ ڈھاکہ، مارشل لا، سیاسی بے سمتی، انسان کی ناقدری، خود غرضی، بے حسی، منافقت، خوابوں کی پژمردگی، بے بسی، شناخت کا مسئلہ، بے چینی اور افراط و تفریط کا دور تھا ایسے میں بشیر صرفی کے ہاں ہر موضوع پر اظہار خیال ملتا ہے۔ بشیر صرفی دکھ کے بیان میں اپنی داخلی کیفیات کو اجتماعی رنگ میں بدلنے میں مہارت رکھتے تھے۔

اجنبیت ہے بعد کا قصہ
پہلے وہ کربِ آشنائی تو دے
ڈھونڈلوں گا میں اپنے آپ کو بھی
تو مگر قید رہائی تو دے
جوشِ وحشت سے دامنِ دل بھی گیا
ہو گیا تار تار سونے دے
کُو بہ کُو چھا گیا سناٹا
ہجر ہے غم گسار سونے دے

بشیر صرفی کی شاعری کا ایک اہم موضوع احساس تنہائی ہے ان کے ہاں کلاسیکی شاعری کے محبوب ترین موضوعات بھی ملتے ہیں مگر جدید شاعر جدید عہد میں ترقی کے باعث تنہائی کا شکار زیادہ ہے۔ اس تنہائی کے احساس نے انسان کے اندر روحانی بحران پیدا کر دیا ہے۔ بیرونی دنیا سے کشید کیے ہوئے منفی رجحانات اقدار کی پامالی اور انسانیت کی تذلیل اور ہماہمی، انسان کو اپنے باطن میں پناہ لینے پر مجبور کرتے ہیں۔

اس حوالے سے پروفیسر وقار احمد رضوی بیان کرتے ہیں:

جدید تر غزل میں جو اہم چیز نظر آتی ہے وہ احساس تنہائی ہے یہ احساس تنہائی مصروف دور کی زندگی کی دین ہے کیونکہ آج کا انسان اس قدر مصروف ہے کہ دوسروں کے غموں میں شریک ہونے کی فرصت نہیں۔ یہ احساس تنہائی دنیا کے ہر ادیب اور ہر شاعر کے ہاں ملتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ جب حالات انسان کو مایوس کر دیتے ہیں تو زندگی میں ایک طرح کی گھٹن اور مایوسی پیدا ہوتی ہے یہی حالت احساس تنہائی کو جنم دیتی ہے اس لیے جدیدیت نے تنہائی کو موضوع سخن بنایا اس کو عیب تصور نہیں کرنا چاہئے کیونکہ معاشرے کو ویرانہ سمجھنے یا ناآسودہ رہنے کی بات نئی نہیں ہے۔ اضطراب اور بے چینی ہر عہد میں رہی ہے ہر حساس انسان ناآسودگی کا شکار رہا ہے۔''

ان حالات میں تمام تر جدت کے باوجود شاعر کے اندر تنہائی کا احساس نمایاں ہو جاتا ہے کیونکہ معاشرے کا ایک حساس فرد ہونے کے ناطے گردوپیش کی تنہائی اسے بے سکون رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ کہہ اٹھتا ہے:

چند ساعت کہیں سوچا ہوتا
میں نہ تنہائی میں رویا ہوتا

بشیر صرفی کے ہاں ایک پوری غزل کی ردیف ہی تنہا ہے چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس تنہائی کو مختلف انداز سے منعکس کرتے ہیں۔

پھر یہ دل اور موہوم تمنا تنہا
جیسے میں تنہا ہوں ویسے میری دنیا تنہا
تیز طوفانی ہو ا مجھ سے لپٹ کر روئی
میں سر شام تیرے شہر میں اترا تنہا
عکس آئینہ بھی اب دشمن جاں لگتا ہے
رو گیا آنکھ میں افسوس کا نقشہ تنہا
میں ہوں بے کیف سی تنہائی ہے
سنگِ دل شہر تنہائی ہے
شام ڈھلتے ہی ہوا ہے محسوس
درد کی لہر ابھر آئی ہے

بشیر صرفی کے نزدیک تنہائی کی زندگی زندگی نہیں ایک اور غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

کتنا تنہا تھا میں پر تنہا نہ تھا
سانس لیتا تھا مگر زندہ نہ تھا
اپنی منزل یاد تھی مجھ کو مگر
یاد منزل کا، مگر رستہ نہ تھا

غمِ فراق اور متاعِ درد جیسا روایتی طرزِ اظہار بشیر صرفی کی شعری روایت میں گہری وابستگی کو ظاہر کرتا ہے، کوئی بھی شاعر روایت کے بغیر جدت کا مکمل طور پر دعوے دار نہیں ہو سکتا روایت کے ساتھ مخصوص جڑت ہی شاعری کی معنویت کو برقرار رکھتی ہے۔

غمِ فراق کو جب پیرہن کیا ہم نے
متاعِ درد کو تم بھی متاعِ جاں کرتے
ہرے دنوں کی ہوا میں تو ملتفت نہ ہوئیں

بہار جاں کو بھلا تا بہ کے خزاں کرتے

اسی کلاسیکی اور روایتی مضمون کا حامل ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

جسے علاج غم دل سمجھ لیا تھا بشیر

وہ درد اپنے لیے تو مدام ہو بھی گیا

بشیر صرفی کے ہاں داخلی مکالمہ ان کی غزل کے مرکزی دھارے کی حیثیت رکھتا ہے ملاحظہ ہو:

ٹوٹ کر میں بکھر گیا ہوں

لذ تِ در د مر گیا ہوں

اپنے ہی دل کے غم کدے میں

چاند بن کر اتر گیا ہوں

تاریکی کا سفر بشیر صرفی کے کلام میں جا بجا ملتا ہے "خود کلامی" ریسٹ ہاوس کی ایک شام" اور "موسم سرما کا ایک دن" ایسی نظمیں جن میں تاریکی اور دھندلکے میں سفر کا امیج ہے۔

یوں نہ ہو شام اداسی کی قبا میں اترے

یوں نہ ہو رات جدائی لیے ملنے آئے

اور جو دشت سزا روح میں در آیا ہے

وہ کہیں ختم بھی ہو

نظم "موسم سرما کا ایک دن" ایک مختصر اور چھوٹی بحر کی نظم ہے لیکن اپنے نفس مضمون کے لحاظ سے یہ نظم بھی اپنے اندر اداسی اور ملگجے اندھیروں میں سفر کا نوحہ ہے پھر وہی اندھیرے اداسی اور مایوسی کا راج ہے گویا دھوپ علامت ہے روشنی کی لیکن افسوس دھوپ صبح منڈیر سے اتری تو تھی لیکن ہماری آنکھوں پر پردہ پڑا رہا یعنی ہم اپنے حالات کو سنوار سکتے تھے ہمیں ایک موقع ملا بھی لیکن ہم غفلت کا شکار رہے۔ گویا اب ہر طرف اداسی کے ڈھیرے ہیں۔

شام پھر لوٹ آئی

چار سو اداسی ہے

دھوپ صبح اتری تھی

صحن کی منڈیروں پر

دھوپ دل کے دروازے

کھولنے کو آئی تھی

آنکھ پر رہا پردہ

دھوپ روٹھ کر نکلی

صحن کی منڈیروں سے

اور اب اندھیرا ہے

چار سو اداسی ہے

"موسم سرما کا ایک دن"

ہجر، جدائی، تنہائی اور تاریکی یہ ایسے جذبے ہیں جن سے بشیر صرفی چاہتے ہوئے بھی پیچھا نہیں چھڑا سکتے جدائی کا غم مستقل طور پر بشیر صرفی کے ساتھ ہے وہ بڑے خوبصورت انداز میں مظاہرِ فطرت سے مثالیں کشید کرتے ہیں شاعر یہ کہتا ہے کہ دسمبر کی ویرانی شام میں درختوں کے پتے زرد ہو کر تالاب میں گر رہے ہیں۔شاعر بھی تنہائی کے گرداب میں لڑکھڑا رہا ہے۔ پھر اپنی ذات کے بکھرنے کا دکھ ہے، تالاب کے پانی کا گدلا ہونا اور معدوم عکس کا نظر آنا ایک طرح سے اپنی ذات کے کھو جانے کا احساس ہے اور کہیں راستہ نظر نہ آنے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ایسے حالات میں اپنی ذات کی پہچان کرنا مشکل ہو رہا ہے پھر وہی مایوسی، تیرگی اور کالی رات جس میں انسان کو اپنی ذات کو پہچاننا مشکل نظر آتا ہے کیونکہ جب حالات اس قدر ناساز گار ہوں کہ کوئی راہ نہ نظر آئے اور حدِ امکان تک تیرگی اور پر پیچ رائیں ہوں تو انسان کی ذات کہیں کھو جاتی ہے۔

اور یہ جو میرے اور میری ذات کے درمیان جو کالی دیوار ہے

جس پہ مرقوم ہے گنجلک پیچ در پیچ سی تیرہ بختی مری

جس کے دونوں طرف حدِ امکان تک

ازل سے ابد تک سیاہ رات ہے

کالی دیوار کو کاش آ کر گرا دے کوئی

اس پر مرقوم یہ گنجلک بھی مٹا دے کوئی

"تنہائی کا غم"

بشیر صرفی کی نظم نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر ارشد معراج بیان کرتے ہیں:

نارسائی بشیر صرفی کی نظموں کا بنیادی موضوع اور حوالہ ہے خواہشات انسانی وجود کے ارتقا اور قیام میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں لیکن انسانی زندگی میں ان خواہشات کا حصول، سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی اقدار و روایات کا مطالبہ کرتا ہے۔بشیر صرفی اس کے ناقد بھی ہیں اور تجزیہ کار بھی ہیں۔"[12]

نارسائی اپنے شعری اظہار میں جس تنہائی کے احساس کو اجاگر کرتی ہے بشیر صرفی کی نظموں میں اس کے حوالے بڑی خوبصورتی سے آئے ہیں ان کی نظم احساس اس کی بہترین مثال ہے۔

میری میراث اگر کوئی تصور ہوتا

کسی معصوم سی لڑکی کے سراپے کا خیال

جو مرے دکھ مری تنہائی کو کم کر دیتا

جس کا احساس میری زیست کی دولت ہوتی

جس کی گفتار میں کلیوں کی صباحت ہوتی

جو مرے درد بھرے دل کو تسلی دیتی

"احساس" ص ۲۳۹

اسی طرح نظم "تنہائی کا غم" میں احساسِ شکست جس ملال کو سامنے لاتا ہے وہ بشیر صرفی کے حساس جمال اور اس کی شدت کو دوچند کر دیتا ہے۔

اور یہ جو مرے اور مری ذات کے درمیان کالی دیوار ہے
جس پہ مرقوم ہے گنجلک پیچ در پیچ سی تیرہ بختی مری
ازل سے ابد تک سیاہ رات ہے
کالی دیوار کو کاش آ کے گرا دے کوئی
اس پہ مرقوم یہ گنجلک تیرگی بھی مٹا دے کوئی

"تنہائی کا غم"

جدید غزل کے موضوعات میں جبر، خوف، بے وقعتی، کم مائیگی اور احساس زیاں ایسے موضوعات ہیں جنھیں جدید غزل کے تقریباً تمام لکھنے والوں نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ بشیر صرفی کے ہاں بھی جدید دور کے بیان کئے گئے جدید موضوعات گہرے شعور کے ساتھ جلوہ گر ہوتے دکھائی دیتے ہے۔

سب مقدر کے اندھیرے آنکھ میں تحریر ہیں
کیوں گرفتار انِ ظلمت کو ڈرائے روشنی
یہ زوال آرزو ہے یا طلوع تیرگی
درد تھم جائے تو پھر دل میں نہ آئے روشنی
خوف کے آسیب سے مانگیں گے رستے کا پتہ
جبر کی زنجیر میں جب کلبلائے روشنی

ان معاشرتی اور سیاسی مسائل نے اس عہد کے ہر شخص کو افسردہ اور بیزار کر دیا ہے اس لیے اس عہد کی شاعری کا مجموعی تاثر بھی قنوطیت کی خصوصیت لیے ہوئے نظر آتا ہے بشیر صرفی کے کلام متروک میں بھی قنوطیت کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔

کیسے پڑا و پڑ گئے اب کے سفر سے قبل
یادوں کا اک حصار بھی ہے بام و در سے قبل
شام الم کی باس ہوا سے لپٹ گئی
وجداں لہو لہو ہوا اس بد خبر سے قبل

ہم اندھیرے میں پھرتے رہتے ہیں
چاند کا جب نشاں نہیں ملتا

ٹوٹتا جب بدن تو گھر ہوتا
میں نہ یوں نقش رہ گزر ہوتا
چل پڑے مرے خانماں برباد
کاش زنداں کا باز در ہوتا

کٹ گیا تو سوچ کر یہ ہول آتا ہے مجھے
بے ثمر ہی تھا شجر سر پہ مگر سایا بھی تھا

مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو ایسا نہیں کہ بشیر صرفی نے تنہائی، ہجر، وصل، مایوسی، یاد، انتظار اور جبر کی داخلی کیفیات تک اپنے آپ کو محدود رکھا گو کہ ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ ان موضوعات پر مبنی ہے لیکن بشیر صرفی اپنے اردگرد سیاسی، سماجی اور روزمرہ معمولات یعنی اپنے عصر سے آگاہی بھرپور انداز میں رکھتے تھے اور اس کا اظہار انہوں نے اپنے کلام میں جابجا کیا بھی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد خان اشرف، ڈاکٹر، اردو ادب، وتحقیقیدی مطالعہ، الوقار پبلی یکیشنز مر، سال اشاعت، ۲۰۰۳ء، ص۱۵

۲۔ محمد حسن، ڈاکٹر، اردو ادب میں رومانوی تحریک، کاروانِ ادب، ملتان، صدر، ۱۹۹۳ء، ص۱۵

۳۔ ایضاً، ص۶۱

۴۔ صباحت قمر (رومانویت) (ایک قدی اصطلاح)، دستاویز مطبوعات، ۲۰۰۵ء، ص۲۱

۵۔ رشید امجد، ڈاکٹر، کلام بشیر صرفی، مرتب، شفیق انجم، ڈاکٹر، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، بیک فلیپ

۶۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، مقدمہ کلام بشیر صرفی، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص۲۰

۷۔ نسیم سحر سے انٹرویو، بمقام سیٹلائیٹ ٹاؤن، راولپنڈی، بوقت ۵ بجے شام مورخہ ۸، جنوری، ۲۰۱۹ء

۸۔ صلاح الدین درویش سے انٹرویو، بمقام ایچ نائن بوائز کالج اسلام آباد بوقت ۱۰:۳۰ صبح ۱۲ فروری ۲۰۱۹ء

۹۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، مقدمہ کلام بشیر صرفی، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص۲۱، ۲۲

۱۰۔ ایضاً، ص۲۴

۱۱۔ وقار احمد رضوی، ڈاکٹر، تاریخ جدید اردو غزل، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، طبع اول، ۱۹۹۸ء، ص۸۸۰

۱۲۔ ارشد معراج ڈاکٹر، رابطہ بذریعہ ڈاک، موصولہ خط، ۱۰ مارچ، ۲۰۱۹ء

باب چہارم:

بشیر صرفی کی شاعری میں انقلابی عناصر کا تجزیہ

الف) انقلاب اور شاعری کا تعلق:

دوسری جنگ عظیم بیسوی صدی میں نو آبادتی نظام کے خاتمے کا باعث بنی کیونکہ جنگ کی ہولناکیوں کے بعد اتحادیوں کو شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اب سیاسی اور معاشی مشکلات کے پیش نظر ان کو اپنا تسلط بر قرار رکھنا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ایک طرف سیاسی و اقتصادی بدحالی تو دوسری طرف یورپی جنگوں کے نتیجے میں نو آبادی نظام پر ایک کاری ضرب لگی جس سے سارا نظام درہم برہم ہو رہ گیا۔اس سے قبل بھی استعماریت کو سیاسی اور سماجی معاشی و ثقافتی سطح پر مزاحمت کا سامنا تھا اس ضمن میں چالیس کی دہائی کے آخری سال انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں نو آبادیات کے تناظر میں استعمار کو شدید سیاسی و ادبی لحاظ سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

تقسیم ہند کا قیام عمل میں آیا اس کے ساتھ ہی نئے ملک پاکستان کو قیادت کا فقدان، سیاسی، معاشی، معاشرتی بحران اور غیر متعینہ سرحدوں جیسی صورتحال سے دوچار ہونا پڑا۔ دوسری طرف مشرق وسطی میں اسرائیل کے قیام کے لیے پیش رفت ہونا شروع ہوئی جس سے فلسطین جغرافیائی اور سیاسی و نفسیاتی سطح پر بری طرح سے محرومی کا شکار ہوا، اس پہ طرہ یہ کہ بیت المقدس کی غیر اعلانیہ تقسیم اور اسرائیل کی ہٹ دھرمی مزاحمت کا باعث بنی۔

اس صورتحال کے پیش نظر ایک ادیب غسان کنفانی نے مزاحمتی ادب کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں مغربی استعماریت کی پوری تاریخ درج تھی علاوہ ازیں مغربی ادب کا کردار اس کے بنیادی عناصر اور وسیع تر مابعد نو آبادیاتی رجحانات اور تفاوت کو زیر بحث لایا گیا۔غسان نے علامتی ابلاغ کے بجائے براہ

راست مزاحمت تشکیل دی علاوہ ازیں غسان نے ادبی ملفوظات کو بھی یکجا کرنے کا فریضہ انجام دیا کیونکہ اسرائیل کی سنسر شپ کی وجہ سے فلسطین میں تخلیق ہونے والا ادب عرب دنیا سے پوشیدہ تھا۔ غسان کے فکری مزاحمتی نظریے کے باعث مقبوضہ فلسطین میں ثقافتی و ادبی سرگرمیاں جبری ثقافتی حصار.. کی صورت اختیار کرنے کے باعث معروف ہوگئیں یہی وہ مقام ہے جہاں مزاحمتی ادب جنم لیتا ہے۔ اس سے قبل انقلاب روس اور فرانس کے بھی ادبی حلقوں میں مختلف معاشی و معاشرتی جبر و استبداد کے خلاف مزاحمت کا آغاز ہوا۔ جس کے باعث ادیبوں نے طلسماتی فضا سے نکل حقیقت کی دنیا میں قدم رکھا۔ بعد ازاں یہی مزاحتی ادب جدیدیت کی صورت میں ایک تناظر سامنے لے کر آیا۔ ادب جمالیاتی اقدار کے ساتھ ساتھ معاشرتی برائیوں کو بھی منعکس کرتا ہے جس کے اثرات ہر شعبہ زندگی پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

مزاحتی ادب جس منظر نامے کو پیش کرتا ہے اس کا ایک مخصوص سیاق و تناظر ہوتا ہے ادب چونکہ انسان کی آواز ہے اور آزادی کا داعی ہے اس لیے بنیادی طور پر مزاحمتی ہوتا ہے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں: عمومی معنوں میں ادب ہوتا ہی مزاحمتی ہے کہ ادیب موجودہ صورتحال اس کے جبر اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔[1]

تاریخ میں عملی مزاحمت کے ساتھ ساتھ فکری مزاحمت بھی رہی ہے:

ڈاکٹر ابرار احمد مزاحمتی ادب کے حوالے سے بیان کرتے ہیں: ادب تخلیق کرنا بذات خود مزاحمتی عمل ہے۔ ایک طرح سے سارا ادب مزاحمتی ہے اور ادیب خود باغی۔[2]

اردو ادب کی روایات کے تناظر میں مزاحمتی رویے ابتدا ہی سے شمالی ہند کی شاعری میں ملتے ہیں۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگزیب کے بعد اس کے نااہل جانشینوں کی بداعمالیوں اور سفاکانہ پالیسوں کے خلاف جعفر زٹلی وہ پہلا شاعر تھا جس نے مزاحمتی شاعری کا آغاز کیا جس کی پاداش میں فرخ سیر کے حکم پر پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

سکہ زد گندم و موٹی و مٹر

پادشاہ ایشہ کسہ شں فرخ سیر

بعد ازاں ایہام گو شعرا نے بھی عہد کے اخلاقی، سیاسی زوال اور فکری انتشار کی عکاسی کی میر کے ہاں بھی ہمیں فکری، سیاسی، اخلاقی اور تہذیبی آشوب بین السطور نمایاں ہوتا نظر آتا ہے۔

چمن خراب کیا ہو، خزاں کا خانہ خراب

نہ گل رہا ہے نہ بلبل ہے باغباں تنہا

کس کہنے سے جاویں ترے ظلم کی فریاد ہم

تجھ ہی سے تری ستم کی چاہتے ہیں داد ہم

میر نے اس عہد کے طبقہ امرا پر تنقید کی ہے۔

ہے زنا و شراب بے وسواس

رعب کو کیجیے یہیں سے قیاس

قصہ کوتاہ رئیس ہیں عیاش

اس عہد میں سودا، ناجی، حاتم، منیر تقریباً سبھی غزل گو شعرا نے اپنے عہد کی بدحالی اور زوال کی واضح صورتیں شہر آشوب لکھ کر بیان کیں۔ غالب کے ہاں بھی مزاحمتی رویہ ماضی کو رد کرتے ہوئے نئے شعور کی بنیاد رکھنے کی صورت میں سامنے آیا جو علی گڑھ کی صورت سامنے آیا جنھوں نے تہذیبی برائیوں کی نشاندہی کی۔ بیسوی صدی میں یہی مزاحمتی رویہ حقیقت پسندی کے روپ میں سامنے آیا۔ نچلے طبقے کے استحصال اور محرومی کو موضوع بنایا گیا یوں ادب نے داستانوں کی مثالی دنیا سے نکل کر حقیقت کا روپ دھارا۔

پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی اشتراکی انقلاب کو دم توڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ریاست کے خلاف سازش کا نام دے کر ادیبوں اور شعرا کو پابند سلاسل کر دیا گیا ان حالات نے اس وقت پاکستان میں باقاعدہ

طور پر ادب میں ایک مزاحمتی فضا قائم کی۔ فیض، جوش، حبیب جالب اور سبط حسن نے ایسے ادب پارے تخلیق کیے جن میں مزاحمتی ادب کا ابتدائیہ باب لکھا گیا۔ ڈاکٹر ابرار احمد بیان کرتے ہیں:

ادیب کا قلم اس کا ہتھیار ہے۔[۳]

مارشل لا کی عائد کردہ پابندیوں کے پیش نظر حبیب جالب نے لکھا۔

ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں جانتا میں نہیں مانتا

دوسری طرف فیض اپنے دھیمے لہجے میں خاموش رہنے والوں کو اٹھنے پر اکساتے ہیں:

بول کے تھوڑا وقت بہت ہے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول جو کچھ کہنا ہے کہ دے

اور پھر مارشل لا کی اظہار پر پابندیوں کے باعث علامت و تجریدیت کا سہارا لیا گیا غیر ملکی مزاحمتی ادب کے تراجم اردو زبان میں کیے گئے، بہر حال غیر ملکی مزاحمتی ادب اپنے ماحول کے تناظر میں تھا جبکہ ہمارے ہاں مزاحمت کے لیے اپنے حالات وواقعات موجود تھے۔

پھر مشینی و سائنسی ترقی نے انسانیت کا وقار ختم کر دیا اخلاقی و تہذیبی اقدار کو کچل کر رکھ دیا بے حسی، خود غرضی، منافقت، سبقت لے جانے کی خواہش، سیاسی و معاشی انتشار، سقوط ڈھاکہ ۱۹۶۵ء کی جنگ مارشل لا کی جبریت اور کشمیر پر غاصبانہ قبضہ ان تمام حالات وواقعات نے اردو شعر وادب میں انقلاب کی ایک نئی فضا کو جنم دیا جس میں جدیدیت کے تحت لکھنے والوں کی ایک نئی کھیپ وجود میں آئی ان نئے لکھنے والوں میں بشیر صرفی کا نام بھی اہم ہے۔ آگے چل کر ہم بشیر صرفی کے ہاں انقلابی عناصر کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

ب) بشیر صرفی کی شاعری میں مزاحمتی عناصر:

مزاحمت در حقیقت کسی طاقتور قوت کی طرف سے نافذ کردہ نظام، نظریے یا فکر سے متعلق محکوم افراد، تنظیم یا معاشرے کی طرف سے انکار کو کہتے ہیں یہ مزاحمتی رویہ کسی قوم، ملک اور معاشرے کے خلاف جبر و استحصال اور ناانصافی کے نتیجے کے طور پر عمل میں آتا ہے جو اس قوم یا معاشرے کے لیے قابل قبول نہیں ہوتا جب ہم ادب میں مزاحمتی رویوں کی بات کرتے ہیں تو ادب بنیادی طور پر مفاہمتی اور مزاحمتی رویوں پر مبنی ہوتا ہے۔ مفاہمتی ادب، فکری رویوں، نظریوں اور جمالیاتی قدروں سے مفاہمت کرنا سیکھاتا ہے جو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں مفاہمتی ادب ان اقدار کو معاشرے کے لیے قابل قبول بناتا ہے۔ مزاحمتی و مفاہمتی رویے معاشرے میں رائج فکری اور جمالیاتی رویوں کو قابل قبول بنانے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

مزاحمتی ادب اور اس کی تشریحات میں نعیم بیگ بیان کرتے ہیں۔

> مزاحمتی ادب کی بہت سی اقسام ہو سکتی ہیں جیسے کسی ادیب کا اپنے آدرشوں، خوابوں یا آئیڈیل کی تکمیل کی راہ میں روکاوٹ محسوس کرنا، ضروری نہیں کسی کہانی کار کی مثالیت معاشرے کی بھی مثالیت ہو۔ بعض اوقات تخلیق کار کسی آئیڈیل کو پیش کرتا ہے مگر معاشرہ اس کے آئیڈیل کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ یوں اس تخلیق کار کی تحریروں میں مزاحمتی رویے جنم لیتے ہیں۔ مزاحمت طے شدہ شدہ رویوں رسم ورواج اور رائج اقدار کے خلاف بھی ہوتی ہے۔ تخلیق کار معاشرے کی از سر نو تشکیل کرتا ہے فرسودہ روایات یا بانجھ فکری تحریکوں کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ ادب کا ایک اور رویہ، سیاسی، تاریخی اور اقداری بیانیوں سے انکار کرنا بھی ہے، عموماً ایسے بیانیے جو کسی حد تک سٹریو ٹائپ تصورات بن چکے ہوں تخلیق کار انھیں قبول کرنے سے انکار کرتا ہے ایک شاعر یا ادیب جو بیانیہ تشکیل دیتا ہے اسے ریاست یا نظام کا متبادل بیانیہ بھی کہا جا سکتا ہے۔[۴]

دنیا کی ہر زبان میں اور ہر دور کے شعر و ادب میں مزاحمتی رویے ملتے ہیں۔ اگر اردو شعر و ادب کا مطالعہ ہم ساٹھ اور ستر کی دہائی کے حوالے سے کریں تو یہ دور موضوعاتی وفنی سطح پر تبدیلیوں کا دور تھا۔ فسادات کا المیہ،، ہجرت کا دکھ، نئ مملکت سے وابستہ خوابوں کی شکست، پاکستانی و اسلامی ادب کے مبا حث اس پر سیاسی صورتحال ابتری اور قومی سطح پر بے سمتی، مارشل کا نفاذ علامت و تجرید کا استعمال رشتوں کی شکست و ریخت ، بے چہرگی کا احساس، منافقانہ رویے، ۱۹۶۵ء کی جنگ اس کے نتیجے میں وطن پرستی، مٹی کی اہمیت کا احساس، نظریاتی بحثوں کا آغاز، سقوط ڈھاکہ کا المیہ اس کے نتیجے میں احساسِ زوال ۱۹۷۷ء کا مارشل لا ان تمام عناصر کے خلاف مزاحمتی رویے اردو شعر و ادب کا حصہ بنے پھر مغرب کی جدیدیت کی تحریک کے زیر اثر نظم کے میدان میں فکری وفنی سطح پر نئے تجربات نے بھی شعر و ادب کو متاثر کیا۔ بشیر صرفی نے بھی سن ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں ایک شاعر کی حیثیت سے اہم کردار ادا کیا۔

ڈاکٹر رشید امجد اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ساٹھ کی دہائی میں جدیدیت کی جو تحریک شروع ہوئی۔ بشیر صرفی کا تعلق اسی سے تھا۔ انہوں نے کبھی بشیر صرفی تو کبھی بشیر وانی کے نام سے لکھا شاعری کا ذوق انھیں ورثے میں ملا راولپنڈی میں نئے لکھنے والوں کا گروپ اس زمانے میں بہت سرگرم تھا بشیر صرفی اس کے متحرک لوگوں میں سے تھے۔[۵]

بشیر صرفی نے اپنے عہد کے تمام نظریات اور رویوں سے اثر قبول کیا اور ان رویوں کا اظہار اپنی شاعری میں کیا۔ ستر کی دہائی میں سقوط ڈھاکہ کا واقعہ اور مارشل لا دو اہم واقعات رونما ہوئے بہر حال ستر اور اسی کا عہد ہر لحاظ سے تبدیلیوں کا دور تھا حساس ذہن ان تبدیلیوں کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے لہٰذا کھل کر اظہار کے بجائے علامت کا سہارا لیا گیا۔ سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں شناخت کا بحران، بے چہرگی کا احساس، عدم تحفظ اور منافقت جیسے رویے قبول عام ہوئے۔ اپنے ہمعصروں کی طرح بشیر صرفی نے بھی ان رویوں کے خلاف مزاحمتی انداز اختیار کیا۔

بشیر صرفی کے ہاں اپنے عہد کے دیگر شعرا کے مقابلے میں مزاحمت اتنی شدت سے نہیں ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ مرکز سے وابستہ نہیں تھے۔بشیر صرفی کے ہاں محض سقوط ڈھاکہ، مارشل لا یا کشمیر کا تناظر نہیں ہے بلکہ معاشرے میں سیاسی، سماجی، معاشی اور اخلاقی ہر سطح پر ہونے والی بے ضابطگیوں اور ناانصافیوں پر مزاحمتی انداز ملتا ہے۔

البتہ کشمیر بشیر صرفی کا دل ہے کشمیر پر جارحیت اور غاضبانہ قبضہ ان کو خون کے آنسو رلاتا ہے۔مظلوم کشمیریوں پر جبر و استبداد کے خلاف مزاحمتی رویے ان کی شاعری میں شدت اختیار کیے ہوئے ہیں لیکن باوجود اس کے وہ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور صبح نو کی امید ان کے ہاں اہم عنصر ہے۔اپنے وطن پاکستان سے بھی وارفتگی کا اظہار ان کے ہاں نمایاں ہے موضوع زیر بحث میں ہم بشیر صرفی کے کلام میں سقوط ڈھاکہ اور مارشل لا کا تناظر اور تحریک آزادی کشمیر کے تناظر کے حوالے سے بحث کریں گے۔

i۔ سقوط ڈھاکہ اور مارشل کالا تناظر:

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ بشیر صرفی کا عہد مستحکم سیاسی صورتحال اور انتشار کا عہد تھا۔ حکمرانوں کی غلط پالیسوں نے پاکستانی معاشرے کو فکری، سماجی اور معاشی سطح پر مسائل سے ہمکنار کیا تھا۔قیادت کے فقدان نے مارشل لا کی صورت میں پناہ ڈھونڈی جس نے فکری و سیاسی سطح پر حالات کو مزید سنگین کر دیا۔ قیادت کے خلا اور سیاسی بے سمتی اور اس پر سقوط ڈھاکہ کا سانحہ رونما ہوا جس نے زوال کے احساس کو مزید گہرا کر دیا جس سے قومی سفر کا رخ خارج سے باطن کی طرف مڑ گیا۔ مجموعی طور پر اس دور کی شا عری میں بے اطمینانی، خوابوں کی شکست اور دوروں بینی کا غالب رجحان ملتا ہے بشیر صرفی بھی انہی شعرا میں شا مل تھے۔

بشیر صرفی کی شاعری جدید طرز فکر اور اظہار کی نمائندگی کرتی ہے چونکہ وہ لکھنے والوں کی انجمن سے وابستہ رہے جس کی وجہ سے ادبی دنیا میں نئے رویوں کو پھیلانے میں ان کا کردار نمایاں ہے۔بشیر صرفی کے مرتبہ مجموعے میں ۳۳ کے قریب نظمیں ان کی فکری مہارت کو ظاہر کرتی ہیں۔ تحریک آزاد کشمیر کے پس

منظر میں لکھی گئی گیارہ منظومات ہیں جبکہ دیگر موضوعات جن میں مارشل لا، سقوط ڈھاکہ اور سیاسی سماجی و اخلاقی موضوعات پر بھی اظہار خیال ملتا ہے۔ کلام متروک میں سقوط ڈھاکہ اور مارشل لا کے نفاذ کے بعد ملک کی مجموعی سیاسی صورتحال علامتی پیرائے میں انہوں نے اپنے عہد کے مسائل کی ترجمانی کی۔

ادب میں علامتی پیرایہ اسی وقت اختیار کی جاتا ہے جب کھل کر اظہار کرنا ممکن نہ ہو۔ پاکستان کے منظر عام پر آنے کے ساتھ جو سیاسی و سماجی و معاشی صورت حال اور توڑ پھوڑ رہی جغرافیائی مسائل، سیاسی عدم استحکام اور معاشی مسائل جو سوالیہ نشان چھوڑے اس سے عوام کے ذہنوں میں شکوک و شبہات نے جنم لیا۔ داخلی کے ساتھ ساتھ خارجی مسائل نے بھی فرد کو مشکلات سے دوچار کیا فرد نے وقت کے دھارے پر اپنے آپ کو چھوڑ دیا لاچارگی و بے بسی کی کیفیت نمایاں ہوئی کیونکہ شعرا اور ادبا کا طبقہ عام انسانوں کی نسبت زیادہ حساس ہے۔ ملکی منظر نامہ اندھیرے کی لپیٹ میں تھا ہر فرد کرب کی کیفیت میں تھا اس پر مارشل لا کے نفاذ نے کرب کی شدت کو مزید بڑھا دیا۔

اردو ادب میں علامت کا پیرایہ گو کہ ابتدا سے ہی موجود ہے کیونکہ شروع سے درباری نظام رائج تھا جہاں کھل کر ہر بات کا اظہار ناممکن نہیں تھا لیکن اردو ادب کے جائزے کے بعد یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مارشل لا کے نفاذ نے علامت کے استعمال کو تقویت دی اور علامتی پیرایہ اظہار شعر اور ادبا کے ہاں کرب کے اظہار کے لیے خاص انداز بن گیا۔ بشیر صرفی کے کلام متروک میں علامت کا انداز زیادہ ملتا ہے۔

وہ زور تھا ہوا کا، شجر چیختے رہے
ہم ہی نہیں تھے شہر میں اس شام بے قرار
اب طوفان کی شدت میں کچھ کمی ہوئی
اب اشکوں نے چین سے بہنا سیکھ لیا
خزاں کی شام ہے اور کیا عذاب ٹوٹے ہیں
چمن میں پھول نگاہوں میں خواب ٹوٹے ہیں

دیوار و در کو اس طرح بارش نے ڈھا دیا
جیسے تمام شہر کسی نے گرا دیا
طوفان میں آشیاں سے پرندے بچھڑ گئے
آندھی نے اس شجر کی جڑوں کو ہلا دیا
امڈ کے برسے تو ہیں شہر سنگ پر بادل
زمیں کی خوشبو کو لیکن ترس گئی بارش

بشیر صرفی کے کلام میں بادل، بارش، شجر، آشیاں، پرندے، چاند، شام، دھوپ کنارہ، آندھی، برف اور سنگ جیسی علامات کا استعمال ہوا۔ سقوط ڈھاکہ اور پھر سیاسی صورت حال کے بگاڑ کے پیش نظر مارشل لا کے نفاذ کی وجہ سے انسان خوشحالی یا اچھے حالات کو ترس گیا۔ ان حالات کے پیش نظر پاکستانی معاشرہ جس طرح بگاڑ کا شکار ہوا وہ غیر یقینی صورتحال، لاچارگی، بے بسی اور عدم تحفظ ہمیں بشیر صرفی کے کلام میں شدت سے محسوس ہوتا ہے یہ وہ احساس ہے جو پاکستان کے ہر شہری کے اندر موجود ہے ہر شخص اسی کشمکش کی کیفیت سے گزر رہا ہے۔ بشیر صرفی کے ہاں اس کا اظہار زیادہ واضح ہے۔

وہ روز تھا ہوا کا شجر چیختے رہے
ہم ہی نہیں تھے شہر میں اس شام بے قرار
دیوار کے نقوش ڈرا نے لگے مجھے
ان پتھروں کو زہر کس نے چٹا دیا

بشیر صرفی کے ہاں اس غیر یقینی صورتحال کے نتیجے میں شکستگی اور خوف کا احساس شدید نمایاں ہے۔ ۷۰ کی دہائی میں سقوط ڈھاکہ کے واقعے نے ہر پاکستانی کو ہلا کر رکھ دیا یہ سانحہ پاکستانی قوم کے لیے اور ہماری آئندہ نسلوں کے لیے نہ صرف تاریخی حوالے سے بلکہ مستقبل کے نقطہ نظر سے ایک تاریک باب کی حیثیت رکھتا ہے یہ واقعہ دو قومی نظریے کے تحت حاصل کیے گئے وطن عزیز کے لیے سوالیہ نشان بن گیا اور

ہماری اس نسل کے لیے جس نے قیام پاکستان کے قریب جنم لیا اور ابھی باشعور نہیں تھی ان کے لیے سقوط ڈھاکہ ایک الم ناک واقعہ تھا۔

بشیر صرفی کا شمار اسی نسل سے تھا۔ بنگلہ دیش کا قیام محض ایک جغرافیائی تقسیم نہ تھی بلکہ پاکستان کا بازو کٹ جانے کے مترادف تھا یہی وجہ ہے کہ رائیگانی کا احساس ۷۰ء کی دہائی میں شاعری کا اہم موضوع بن کر ابھرا اس کیفیت نے نفسیاتی سطح کئی کہی سوالات کو جنم دیا جس سے بے چہرگی، شناخت اور تشخص جیسے موضوعات ابھرے۔ بشیر صرفی کے کلام متروک میں ان موضوعات کے حوالے سے اشعار ملتے ہیں۔

ہر دل کے آئینے پہ ثقاوت کی دھول ہے
اب اپنا عکس ڈھونڈنے جانا فضول ہے
تمام عمر رہی اپنی ہی تلاش ہمیں
بس اک لحظہ رکے پھر رواں سے ہو گئے

انسان بیرونی دنیا سے جب تنگ آجاتا ہے یا حالات سے فرار چاہتا ہے تو اپنے اندرون میں پناہ لیتا ہے۔ وہ ایک ایسے غم خوار ساتھی کی تلاش میں ہوتا ہے جسے وہ اپنا راز داں بنا سکے اس ساتھی کو بشیر صرفی اپنے درون دل میں تلاش کرتے ہیں:

کب تک ہنسیں گے تجھ پہ باہر کے آدمی
اور کتنے خوش ہیں دیکھیے ہر نگر کے آدمی
وحشی بنے تو خون بہا کر بھی ہنس پڑے
رو دے کبھی اکیلے میں جی بھر کے آدمی
میں غم کا بوجھ لے کے پھروں تا کہے بشیر
جب درد سے چیختے ہیں پتھر کے آدمی

اس دور کے معاشرتی و سیاسی مسائل کے ہاتھوں ہر فرد بے زار تھا۔ اس عہد میں شاعری کا مجموعی تاثر بھی قنوطیت لیے ہوئے تھا۔ بشیر صرفی کے کلام میں بھی قنوطیت کا رنگ غالب ہے۔

کیسے پڑاو پڑ گئے اب کے سفر سے قبل
یادوں کا اک حصار بھی ہے بام و در سے قبل
شام الم کی باس ہوا سے لپٹ گئی
وجداں لہو لہو ہوا اس بد خبر سے قبل
ہم اندھیرے میں پھرتے رہتے ہیں
چاند کا جب نشاں نہیں ملتا
ٹوٹتا جب بدن تو گھر ہوتا
میں نہ یوں نقش رہ گزر ہوتا
چل پڑے مرے خانماں برباد
کاش زنداں کا باز در ہوتا
کٹ گیا تو سوچ کر یہ ہول آتا ہے مجھے
بے ثمر ہی تھا شجر سر پہ مگر سایا بھی تھا

پاکستانی سیاست دانوں کی ناعاقبت اندیشانہ پالیسوں اور غفلت کی وجہ سے پاکستان مسائل سے ہمکنار ہوا یکے بعد دیگر مارشل لا کا نفاذ معاشرے میں افراتفری واضطراب کا باعث بنا جس سے مزاحمتی رویے ہر سطح پر پیدا ہوئے۔ ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانے پر مزاحمت جنم لیتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہی مزاحمتی انداز اسی کی دہائی میں زور پکڑ تا ہے اور مزاحمت اور احتجاج کی سی کیفیت رونما ہوتی ہے جس کا اظہار ادب میں بھی شدت کے ساتھ ہوا۔

مزاحمت کے حوالے سے ڈاکٹر صائمہ نذیر لکھتی ہیں:

> مزاحمت اور احتجاج کے کئی پہلو ہیں ایک پہلو جو سب سے توانا ہے یہ کہ پہکار پر اتر تا ہے اسے یہ نظام قبول نہیں ہے وہ اس کو بدلنے کے لیے آواز اٹھاتا ہے۔[۶]

بشیر صرفی کے کلام میں یہ مزاحمتی رنگ پیکار کی صورت کی نظر آتا ہے اور وہ نظام کے خلاف آواز بلند کرتے نظر آتے ہیں۔

سروں کی فصل سے کیا شہ سوار مانگتا ہے
لہو کو چاٹ کے اب، اقتدار مانگتا ہے
ہے انتظار کہ کس دن غریب کا پندار
اتر کے آنکھ میں اپنا خمار مانگتا ہے
سر صلیب یہ کیسی آوازیں آتی ہیں
یہ کس کا خوں ہے جو اپنا شمار مانگتا ہے
ہم کر چکے جس کے لیے سر بلند علم
دشمن کے نام اسی نے کیا فتح کو رقم

اب بشیر صرفی کے منتخب کردہ کلام میں اگر ان کی منظومات کا جائزہ لیا جائے تو ان کے مرتبہ مجموعے میں شامل ۳۳ نظموں میں زیادہ تر نظمیں کشمیر، سقوط ڈھاکہ اور مارشل لا کے حوالے سے موضوعات پر مبنی ہیں جب کہ دیگر مختلف موضوعات جیسے عشقیہ، اخلاقی، اور رومانوی انداز کی حامل ہیں۔بشیر صرفی کی منظومات میں اولین نظم ''گینگ ریپ'' میں مرتب نے حاشیے میں لکھا ہے کہ اس نظم کے دیگر مجوزہ عنوانات اسے سانحہ کشمیر یا سقوط ڈھاکہ سے جوڑنے کا اشارہ بھی کرتے ہیں۔ نظم کو اگر کسی ایسے سانحے یا حادثے سے وابستہ کر کے پڑھا جائے تو یہ قومی سطح کے نوحوں میں شامل ہو جاتی ہے۔ سقوط ڈھاکہ ہو یا مسلہ کشمیر پاکستانی قوم کے ساتھ ہونے والے دھوکے اور جبر و ناانصافی کا دکھ قاری کو متاثر کرتا ہے۔بشیر صرفی ایک انتہائی ہوشمند اور باتوفیق شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں یعنی وہ اس نظم کا عنوان ''گینگ ریپ'' رکھ کر اسے مجموعی طور پر ہمارا المیہ قرار دیتے ہیں اور امید و بیم کی جو کشمکش انسان کی قسمت میں لکھی ہے پھر آدم کی مٹی سے تخلیق اور آگ

کی تپش اسے خیر و شر کی آویزش میں مبتلا رکھتی ہے۔بشیر صرفی کے نزدیک انسان کا تمام تر سفر اندھیرے کا سفر ہے اور وقت کے اس لامتناہی سفر پر انسان کی کیفیت کچھ یوں ہے۔

ہمارے ہاتھ تو اپنے ہی خون سے بھرے ہیں
تو دست خونین سے صفحہ وقت پر اک نگاہ نو ہو
خزاں گزیدہ ہیں ہم سب
تو فصل گل کی بشارتیں بن کے کہہ دو بہار نو ہو

ساٹھ کی دہائی میں ملکی و سیاسی بے سمتی اور بین الاقوامی سطح پر طبقاتی کش مکش اور پھر پاکستان کی سر زمین کے حوالے سے خوابوں کی شکستگی نے شخصیت کی تلاش، ذاتی کرب، ظاہر اور باطن کا تضاد یہ رویے جدید انسان کی دانشوری کا اہم پہلو تھے۔بشیر صرفی کے ہاں بھی خسارہ، لا حاصل نارسائی اور بیگانگی جیسے جذبات کا احساس ابھرا۔ سقوط ڈھاکہ اور سیاسی حالات نے خاص طور پر امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔پاکستان بنانے کے لیے جس سفر کا آغاز ہوا تھا۔بشیر صرفی کے ہاں پاکستان بننے کے بعد بھی وہ سفر ختم نہیں ہوا۔مسلہ کشمیر اور سقوط ڈھاکہ کی صورتحال کی وجہ سے یہ سفر ابھی جاری ہے۔

چنانچہ بشیر صرفی یوں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں:

وہ رات ٹوٹی ہے ہم پہ یارو کہ جس کی کوئی سحر نہیں ہے
کہ اپنے ادراک و وہم کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے
ایک ایسی تشکیک کا عمل ہے
کہ جس سے اقدار کا سراپا خجل خجل ہے
سفر ہے درپیش جس سے کوئی مفر نہیں ہے
شبِ سیاہ کی سحر نہیں ہے
اک ایسی آواز آرہی ہے جس نے ہر ساز کا ترنم دبا دیا

کہ حرف شریں بھی بے اثر ہے

چلو کہ در پیش ہم سبھی کو نیا سفر ہے

یہ امید اور نشاطیہ لہجہ صرف انھی نظموں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ دیگر منظومات میں بھی جابجا اپنی جھلک دکھاتا ہے۔"۳۱ دسمبر کی رات" میں شاعر اپنے دوستوں اور ہمرائیوں کو سال کی آخری رات میں اندھیرے کا مقابلہ اپنے گوہر صفت اشکوں سے کرنے کی دعوت دیتا ہے اور یارانِ رفتہ کو آواز دے کر ان کی یادیں منور کر کے جشن کی دعوت دیتے ہوئے ایک بار پھر تیرگی کا مقابلہ مظاہر زندگی سے کرنے کی تجویز دیتا ہے پھر ایک ایسے بچے کا ذکر کرتا ہے جس کی کوئی منزل نہیں اور بے ارادہ اور بے مقصد سفر میں ہے وہ کہیں بھیڑ میں کھو گیا ہے وہ انجان رستوں پہ نکل گیا ہے شام ہونے کو ہے اور گھر نہیں لوٹا اس انجان بچے سے شاعر کی مراد نوازئیدہ مملکتِ خدادِ پاکستان بھی ہو سکتا ہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد پاکستان کے سیاسی و معاشی حالات کچھ اس قسم کا شکار ہو گئے تھے جو ایک نئے ملک کو سنبھلنے کے لیے ساز گار نہیں تھے ملک سیاسی بے سمتی کا شکار ہو گیا تھا اور پاکستان بننے سے پہلے جو نئے ملک سے لوگوں کی توقعات وابستہ تھیں وہ ملک بننے کے بعد مایوس کن ثابت ہوئیں پاکستان کو منزل سمجھنے والوں کے خواب چکنا چور ہوئے۔ سیاسی انتشار ملک کو انجان راستوں کی طرف لے گیا۔ جس سے حساس ذہنوں نے بہت اثر قبول کیا۔ بشیر صرفی بھی غالباً اسی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ آؤ اس بچے کو ڈھونڈیں اور اپنے اشکوں کی سوغات دیں گویا ان حالات پہ وہ آنسو بہانا چاہتے ہیں لیکن پھر رجائی نقطہ نظر نمایاں ہوتا ہے ان اشکوں کو گوہر کرنے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ پھر دسمبر کی اس آخری رات میں بچھڑ جانے والے یار دوستوں کی یادوں کو بھی تازہ کرتے ہیں گویا اپنی یادوں میں بچھڑے ہوئے یاروں کا تذکرہ کر کے ایک جشن برپا کرنا چاہتے ہیں جو ایک مثبت پہلو ہے۔

آوارہ اشکوں کو گوہر کریں اور پھر

طشتِ دل میں سجا کر دسمبر کی اس آخری رات میں

یوں اچھالیں کہ یارانِ رفتہ کی یادیں منور کریں

ان کو آواز دیں، جشن برپا کریں

"دسمبر کی آخری رات" ص ۴۲۲

مشینی دور نے ایک طرف انسان کو ترقی کے راستے پر گامزن کیا تو دوسری طرف ایک نئ تہذیب کو جنم دیا جس نے سیاسی، مذہبی، سماجی اور تہذیبی جبر کے ساتھ ساتھ مارشل لا اور ذات کی اہمیت و ضرورت کا احساس بھی اجاگر کیا۔

بشیر صرفی کے ہاں انھی حالات کے اثرات ملتے ہیں۔ان کی تازہ نظم "نارسیدہ" میں ایسے عالم میں حوصلوں کی پستی، تاریکی شجر کا بے ثمر ہونا، بے بسی کا عذاب، مایوسی اور فصل بہار میں لطافتوں کی تلاش، مگر خزاں کا مقدر ٹھہرنا، موسموں کی بے رنگی اور شب وروز کی قید یہ سب باتیں ان حالات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں جو اس عہد میں ہر حساس انسان محسوس کر رہا تھا۔

دھواں دھواں اس کے حوصلے ہیں
نظر نظر شب گزیدگی کا سماں لیے ہیں
وہ بے ثمر سے شجر کی شرمندگی بنا ہے
شجر کہ جو اپنی ناکسی پر گرے ہوئے پتوں کے آنسوؤں کی
دبیز چادر کی اوٹ میں اس برہنگی کو چھپا رہا ہے
کہ جس پر نادیدہ زندہ لاشیں
رکی ہوئی ساعتوں کی مانند چپک گئی ہیں
وہ شب و روز کی جکڑ میں عذاب بن کر پڑا ہوا ہے

بشیر صرفی کی نظم "بل احیا" ایک نوحہ ہے خواہ وہ واقعہ کربلا کا ہو یا سقوط ڈھاکہ کا اس نظم کے عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ واقعہ کربلا دائمی زندگی کی روایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب اپنے وطن کے تحفظ کی خاطر لہو بہایا جائے گا۔ تو واقعہ کربلا کی یاد تازہ ہو گی۔ بشیر صرفی کے نزدیک خواہ کربلا کا واقعہ، کشمیر کا واقعہ ہو یا سقوط

ڈھاکہ لہو بہانا ایک مقدس عمل تھا۔ اپنے لہو سے اپنی دھرتی کا تحفظ کرنا عظمت کی دلیل ہے جب یہ لہو دھرتی کی مٹی میں شامل ہوتا ہے تو وہ لمحہ جاوداں بن جاتا ہے۔

جب لہو بہہ چکا

اور دھرتی نے اس کو ابد کے لیے

آسماں کی بلندی سے زیادہ عقیدت کے ساتھ

اپنی ہر اک رگ وپے میں سینچا

تو مٹی کو اک لمحہ جاوداں مل گیا

کشمیر کے حوالے سے بشیر صرفی کے جذبات ہوں یا سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے وہ اپنے کلام میں مٹی کی خاطر مر مٹنے والوں کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔بشیر صرفی کی غزل کا جائزہ لیا جائے تو بھی ان کے ہاں عصری شعور کی مکمل آگاہی ملتی ہے ان کی غزل کا دائرہ وسیع ہے ان کی غزلیہ شاعری اس عہد کے حالات کے پس منظر میں پیدا ہونے والے مسائل کا عکس لیے ہوئے ہے۔ گو کہ بشیر صرفی کی غزل کا ایک بڑا حصہ تنہائی، ہجر یاد، وصل اور انتظار کی داخلی کیفیات پر مبنی ہے لیکن انھوں نے اپنے گردوپیش کے سیاسی و سماجی معاملات کو بھی غزل میں سمویا ہے، پاکستان کی سیاسی صورتحال کو بھی انھوں نے اپنی غزل میں موضوع بنایا۔ جب مارشل لا کے زیر اثر اظہار پر پابندیوں کے خلاف بھی دبے لفظوں میں مزاحمت کی پھر لوگوں کے سماجی رویوں پر بھی اظہار خیال کیا۔ غیر یقینی حالات کے سایوں میں زندگی گزارنے کے سبب ان کی غزل انہی رویوں کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔

شہر میں چار طرف موجہ خوں ہے حرفی

اور کچھ بھی نہیں حد افق سے پہلے

یہ ہمارا شہر اس قتل کا اک میدان ہے

خون نہ حق پر پڑی ہے ریت، دروازہ نہ کھول

تعبیر کی تلاش میں سرِ راہ رہ گیا

ہم نہ رہے یہ عالم

نظم "درد مشترک" میں حالات کی سنگینی اور جبر کا تسلسل ہے۔ اس میں سماجی بندھنوں اور مصلحتوں کو محبت کرنے والوں کے لیے جبر قرار دیا گیا ہے۔ ان کے ہاں جبر کے تسلسل کے ساتھ ساتھ ہجر جدائی کی تڑپ، خوابوں اور جذبوں کا ٹوٹنا ایک تکلیف دہ امر ہے اس پر آنسوؤں کا مصلحتوں کی بھینٹ چڑھ جانا . پہ ےبھ ی کا پنجرے میں تڑپنا اور پنجرے کی دیواروں سے ٹکرانا انتہائی اذیت ناک ہے لیکن اس صورتحال میں کمال جرات و ہمت کے ساتھ زندہ رہنے کا حوصلہ بھی ڈھونڈ نکالتے ہیں محبوب کے ہونٹوں کی سرخی اور اس کی ستارہ ساز آنکھوں میں گویا امید کے دامن میں زندگی کرنے کا جواز تلاش کر لیتے ہیں مگر اس جبر پر نالاں ہیں جو صدیوں کے سفر کی صورت میں لالکے نام لکھ دیا گیا ہے سفر کی ایمجر ی بشیر صرفی کی نظموں میں ملتی ہے سفر زندگی کی مشکلات کا استعارہ ہے گھر سکون اور راحت کی علامت ہوتا ہے جبکہ مسلسل سفر میں بھوک، تکلیف، پیاس، بے آرامی سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے اس نظم میں جبر بنیادی موضوع ہے۔

زندہ رہنے کی کہ مرنے کی سبھی رسمیں ہوئیں
آرسی صحف میں کس کا چہرہ کس کا عکس تھا
اور روحوں کو کڑے بن باس سے کب تھا مفر
جبر کے لمحے نے کیوں لکھے ہمارے نام

"صدیوں کا سفر" ص۲۲۱

بشیر صرفی کی دو نظموں میں بعنوان "نظم" احساس شکست اور ملال دوچند ہے ناحاصل نارسائی کے جذبات کی شدت ہے ان کی یہ نظمیں یاسیت میں ڈھوبی ہوئیں ہیں یہ محض کسی انسان یا قوم کا نوحہ نہیں ہے بلکہ ایک تہذیب کی صدیوں سے بربادی کی داستان ہے کہ جس نے زوال کو ہی اپنا مقدر بنایا۔

ہم اپنے بے نور عہد کا بدمزہ ثمر ہیں

فضا میں بھٹکی ہوئی صدا ہیں

ہماری تقدیر اندھی رائیں

کہ جن پہ صدیوں سے چل رہے ہیں

اور آج بھی روز اول کی طرح

گرم سفر ہیں

بھیانک آسیب سے شکستہ

پرانا دل دوز سا کھنڈر ہیں

ص۲۲۹

یہ ایسا دشوار گذار سفر ہے جس میں ذلت ورسوائی کی بے انتہا منزلیں ہیں اور کارواں ایسا ہے کہ جسے اپنی ذلت اور غلامی کا احساس تک نہیں

کتنا جاں کاہ تھا تپتے ہوئے صحرا کا سفر

اس سے بڑھ کر تھی عذاب اپنی گرانباری غم

راہ اور اتنی کٹھن، درد اور اتنا شدید

لحظہ لحظہ ہی سلگتی رہی موہوم امید

اور دم توڑ گئی مری حسرت دید

''نظم ''ص۲۲۸

والدین اولاد کے لیے بڑا قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں بشیر صرفی نے اپنے والد مرحوم کی پہلی برسی کے موقعے پر بڑے دل دوز انداز میں ایک نظم ''نالہ دل'' کے عنوان سے کہی ہے جس میں انھوں نے اپنے والد کی کاوشوں اور صلاحیتوں کو بڑے خوبصورت انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے یہ چار مصرعوں پر مبنی ایک طویل نظم ہے جس میں بشیر صرفی اپنے والد کی رفاقت سے محروم ہونے کے بعد اپنے کرب کا ذکر کرتے ہیں کہ اب

ہر طرف تنہائی ہماری رفیق ہے زندگی کا ساز آپ کے بغیر زندگی کے سوز میں بدل گیا ہے زندگی کی تمام تر رعنائیاں والدین کے دم سے ہوتی ہیں۔

بشیر صرفی کے ہاں کلام متروک کا ایک بڑا موضوع مزاحمت ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے علامت کا سہارا بھی لیا جو کہ مزاحمتی ادب کی خاص پہچان بھی ہے اسی وجہ سے مخصوص لفظیات بھی ان کے ہاں ملتی ہیں جو اس موضوع پر لکھنے والے دیگر شعرا کے کلام میں بھی شامل رہی ہیں۔

سر صلیب یہ کیسی صدائیں آتی ہیں
یہ کسی کا خون ہے جو اپنا شمار مانگتا ہے
ہم کر چکے ہیں جس کے لیے سر بلند علم
دشمن کے نام اس نے کیا فتح کو رقم

مجموعی طور بشیر صرفی نے اپنی شاعری میں ذاتی دردوکرب کے علاوہ ملکی و بین الاقوامی حالات ومسائل کو بڑی خوبی سے نبھایا ملکی تاریخ میں ہونے والے ہر واقعے اور سانحے پر اظہار خیال کرنا اپنا ادبی فرض سمجھا۔ اور وطن کے ساتھ محبت اور وابستگی کا اظہار کیا اس کے باوجود شاعری میں اپنی انفرادیت اور جاذبیت کے عنصر کو برقرار رکھا۔

ii۔ تحریک آزادی کشمیر کا تناظر:

شاعری کسی قوم کی مجموعی ذہنی وجذباتی کیفیات کی عکاس ہوتی ہے اپنی دھرتی سے عقیدت ومحبت کا اظہار انسان کی فطرت اور اس کے خمیر میں ہوتا ہے۔ جہاں ایک طرف مسلمانانِ ہند میں قیام پاکستان سے ایک اطمینان اور مسرت کی لہر دوڑ گئی وہاں دوسری طرف ہجرت، فسادات اور کشمیر کا المیہ ہمیں ورثے میں ملا۔ قیام پاکستان کے بعد جہاں ایک طرف دیگر مسائل سے پاکستانی قوم کو نپٹنا پڑا وہاں ایک بڑے مسئلے سے بھی ہمیں دوچار ہونا پڑا۔

کشمیر کے معاملے پر دو مکار قوموں کی ریشہ دوائیوں کی بنا پر کشمیری اور پاکستانی قوم کو شدید دھچکا لگا شعرا کے حساس ذہنوں نے بھی اس جبریت و جارحیت کے خلاف شدید رد عمل کا اظہار کیا۔ شعرا کے قلم تلوار کی دھار بن گئے اردو شعرا نے ملی و قومی جوش و جذبے سے سرشار ہو کر کشمیر کو شاعری کے مستقل موضوع کی حیثیت دے دی۔

کشمیر نہ صرف جغرافیائی لحاظ سے بلکہ پاکستان کے نام کے ایک حرف کی حیثیت سے ایک زندہ حقیقت ہے کشمیر میں ہونے والے جبر و تشدد، سیاسی چالوں نے پاکستانی شعرا و ادبا کی تحریروں میں اس موضوع کو نمایاں حیثیت دی۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کا موضوع مستقل طور پر اردو شاعری کا جزو بن چکا ہے۔ تو بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ خود کشمیری قوم اس موضوع پر اپنے درد و کرب کا اظہار نہ کرے۔

کلیم اختر کشمیری شعرا کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

> طلب اور جستجو کا جذبہ کشمیری شاعروں میں حریتِ فکر اور حریت عمل کا سرچشمہ بن گیا جب ان کی تخلیق کا کرب بڑھتا ہے تو اپنے جذبات اور احساسات کی آگ کو چشموں کے پانیوں کی مانند اپنے ہم وطنوں کے رگ و ریشہ میں دوڑا دینے کے لیے تڑپ اٹھتے ہیں اور یہی کشمیری شاعروں کا سب سے بڑا کمال ہے۔[۲]

بشیر صرفی نہ صرف کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ ان کا خاندان جدوجہد آزادی کشمیر میں نمایاں مقام رکھتا ہے ان کے والد عبد الاحد وانی کا شمار کشمیر کے سرگرم مجاہدین میں ہوتا ہے۔ بشیر صرفی اور ان کے خاندان کے کئی افراد قلمی محاذ پر آج بھی کشمیر کاز کیلئے جنگ لڑ رہے ہیں۔ ان میں بشیر صرفی کے بھانجے اطہر وانی کا نام نمایاں ہے جو ایک اخبار کشمیر کے حوالے سے "کشمیر ایکسپریس" نکالتے ہیں اور کشمیر کے حوالے سے عملی طور پر بھی سرگرم ہیں۔

بشیر صرفی نے بھی قلمی محاذ پر یہ جنگ لڑی چونکہ وہ ریڈیو چینل "پنڈی تھری" سے وابستہ رہے وہاں کشمیری ماونیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے وہاں کشمیر کے حوالے سے مختلف پروگرام بھی نشر کرتے رہے۔

اشرف انصاری اپنے ایک انٹرویو میں بیان کرتے ہیں:

> بشیر صرفی کی شاعری اور نثر نگاری کا ایک اہم حوالہ کشمیر ہے ریڈیو پروڈیوسر کی حیثیت سے انھوں نے تحریک آزادی کشمیر کے مقصد کو آگے بڑھانے کیلئے بہت کچھ لکھااور نشر کیا۔[۸]

بشیر صرفی عمر بھر جہد وجہد آزادیِ کشمیر کے کاز کو آگے بڑھانے میں کوشاں رہے اس سلسلے میں قلمی اور عملی دنوں محاذوں پر سر گرمِ عمل رہے اور بشیر صرفی اپنے غیر مطبوعہ کلام "نذر جان" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> یہ مختصر سا مجموعہ تحریک آزادی کشمیر کے ان عظیم مجاہدوں غازیوں اور شہیدوں کے حضور عقیدتوں کے چند پھول ہیں جنھوں نے اپنے لہو سے ابد صفت [illegible] روشن کی ہیں۔ انھوں نے پامردی اور حوصلہ مندی سے طاغوت اور تمام استبدادی قوتوں کا سر جھکا دیا ہے۔ اس کے علاوہ اس مجموعے کا مقصد پاکستان اور بیرون ملک ادیب دانشوروں اور شاعروں میں کشمیر کی آزادی اور کشمیری عوام سے یکجہتی کو اپنی شاعری اور ادنی تخلیقات کا موضوع بنانے کے لیے تحریک پیدا کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کشمیر کی آزادی ہماری عصری اردو ادب کا ایک بہت بڑا موضوع بن کر ابھرے گی اوراس موضوع سے گریز پائی کا دیرینہ رجحان ختم ہو گا۔[۹]

بشیر صرفی کے کلام کا جائزہ لیا جائے جو انہوں نے کشمیر کے موضوع پر لکھا ہے تو گویا کشمیر کے ذکر سے ان کی حالت متغیر ہو جاتی ہے۔ کشمیر سے بشیر صرفی کی وابستگی کے حوالے سے ڈاکٹر صلاح الدین بیان کرتے ہیں:

> کشمیر بشیر صرفی کا گویا خون ہے جو ان کے زخموں سے رِس رہا ہے کشمیر کی غلامی اور وہاں کے بسنے والے مسلمانوں کی بے بسی ان کے جی کا وہ روگ ہے جس سے تمام عمر وہ رہانہ ہو پائے۔ چنانچہ جب بھی ان کی شاعری میں کشمیر کا ذکر آتا ہے قلم سے لہو ٹپکنے لگتا ہے اور دکھ کی عمیق لہر سطر در سطر دوڑتی چلی جاتی ہے۔[۱۰]

کشمیر کے معاملے میں ان کی شاعری سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ کشمیریات کے حوالے سے دونوں اطراف سے کی جانے والی سیاست پر بھی نالاں ہیں ان کے خیال میں سیاست دانوں نے گویا کشمیر کے

خون کا سودا کر دیا ہے کشمیریوں کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ کے اپنی سیاست چمکا رہے ہیں وہ اس بات کو چھپانا چاہتے ہیں کہ اقوام عالم کی بے بسی اب کشمیری رہنماؤں کے دلوں میں بھی گھر کر چکی ہے۔

اشرف انصاری کشمیر کے حوالے سے بشیر صرفی کے جذبات کو یوں بیان کرتے ہیں:

> مقبوضہ کشمیر میں بھارتی قابض فوج کے مظالم پر ان کا ردعمل شدید تھا۔ وہ تحریک حریت میں شامل کشمیری نوجوانوں کو خراج عقیدت پیش کرتے رہے۔ کشمیر سے متعلق ان کی شاعری میں وطن سے محبت کا جذبہ آخری حدوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔ ایک نظم "صبح آزادی" میں تخیل کی آنکھ سے کشمیر کو بھارتی قبضے سے آزاد دیکھتے ہیں ان کے کلام میں سیاست کا سایہ بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ صرفی ان نوجوان دانشوروں میں شامل تھے جو وادی کشمیر سے اجڑ کر راولپنڈی آئے تھے اور تحریک آزادی کشمیر میں قلم کے ذریعے اپنے جوہر دکھا رہے تھے یہ وہ لوگ تھے جو قدم قدم پر بوجوہ مایوس ہوتے گئے اور یاسیت نے ان کی شخصیت کو بڑی حد تک گہنا دیا۔ وہ انیس اکہتر کے سانحہ مشرقی پاکستان سے بھی بہت رنجیدہ خاطر تھے ان کے کلام میں یاس و غم کا یہی پس منظر تھا۔[۱۱]

بشیر صرفی کے کلام میں ۲۱ منظومات کشمیر اور آزادی کشمیر کے متعلق ہیں یہ تمام منظومات بشیر صرفی کے اس کلام میں شامل ہیں جسے انھوں نے قبولیت کی سند بخشی اس سلسلے میں نظموں میں زیادہ تر جن موضوعات پر لکھا گیا ہے ان پر ایک ایک کر کے بات کی جائے گی پہلا موضوع کشمیری مسلمانوں پر بھارتی درندوں کا ظلم و ستم ہے انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کشمیر میں ایک معمول کی حیثیت رکھتی ہیں ان کے ذریعے بھارت نے کشمیر کی حریت اور روحِ حریت کو دبانے کی کوشش کی ہے لیکن ان تمام مظالم کے باوجود وہ کشمیریوں کی جدوجہد کا جذبہ سرد نہیں کر سکے۔

وہ رات ٹوٹی وطن پہ اپنے، بتاؤ اس کی سحر کہاں ہے
کہ اپنے ادراک و وہم کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے
کہ جسم و جاں میں نئی نئی دوریاں ہیں

کہ دوست دشمن کے ہاتھ سے اب

تمام اقدار کا سراپا خجل خجل ہے

سفر ہے درپیش جس سے کوئی مفر نہیں ہے

شب سیاہ کی سحر نہیں کیا

یہ کیسی آواز آرہی ہے

کہ جس نے ہر ساز کا ترنم دبا دیا

کہ حرف شریں بھی بے اثر ہے

چلو کہ درپیش ہم سبھی کو نیا سفر ہے

"کپواڑہ میں بھارتی درندوں کا کریک ڈاون" ص ۲۵۲

اسی طرح بشیر صرفی اپنی نظم "صبح آزادی" میں صبح کی نوید سناتے ہیں کہ اب ظلم کی حد ہو گئی ہے کشمیری مسلمانوں کے خون کی خوشبو اب رنگ لائے گی ابلیس، نمرود اور قارون کا قانون ختم ہو کر رہے گا وہ اپنی قوم کو ہمت اور نیا جذبہ دیتے ہیں کہ اب زندان کی کڑیاں ٹوٹنے والی ہیں دشمن کب تک ظلم و بربریت کا بازار گرم رکھے گا جس طرح ہر سیاہ رات کے بعد صبح کا ظہور ضرور ہوتا ہے اسی طرح ہر ظلم کے بعد انصاف کا بول بالا ضرور ہوتا ہے گویا آزادی کشمیر کے لیے وہ پر امید ہیں۔

اب خون کی خوشبو بولے گی

اب ظلم کی کشتی ڈھولے گی

تاریخ یہ باب بھی کھولے گی

اب آنکھیں منظر لوٹیں گی

جذبوں سے بہاریں پھوٹیں گی

لو ظلم کا قانون گیا

ابلیس کا ہر مضمون گیا
نمرود گیا ۔۔۔ قارون گیا

"صبح آزادی" ص ۲۸۴

مقبوضہ کشمیر جسے شاعروں اور ادیبوں نے جنت نظیر قرار دیا تقریباً پون صدی کا عرصہ گذر جانے کے باوجود غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے ہر گھر سے شہدا کی طویل فہرست نکلے گی لیکن یہ شہادتیں کشمیر کے ماتھے کا سنہری جھومر ہیں کشمیری مجاہدین اور نوجوان اپنے وطن کی آزادی کا یہ خواب سالوں سے اپنی آنکھوں میں بسائے ہوئے ہیں اور اسی امید پر اپنا جہاد جاری رکھے ہوئے ہیں ان شہدا کی اموات پسماند گان کے لیے باعثِ تکلیف نہیں تھیں بلکہ ان کے لیے سرمایہ افتخار بن جاتی ہیں چنانچہ جب کشمیری شہید کی میت گھر آتی ہے تو کہرام برپا نہیں ہوتا بلکہ ابدیت کا علمبر دار آتا ہے۔

یوں ہر شام کوئی جانِ بہاراں آیا
موت کی مستی میں سرشار و خراماں آیا
اس کے چہرے پہ سحر تاب لہو کی شمعیں
تیرہ بختوں کے لیے سرورِ چراغاں آیا
ایک تہی دست مسافر تھا جو گھر سے نکلا
شام لوٹا تو ابد رنگ میں تاباں آیا
آج فرزند کو ہے رخصتِ مادر درکار
آج تو ملک عدم جانے کو مہمان آیا
اس نے تو خاک کو گل رنگ کیا ہے ایسے
کاہِ بے مایہ کو انداز گلستان آیا

لکھ گیا خون سے تحریر حیاتِ ابدی
پردہ مرگ میں وہ تارِ رگ جاں آیا

ص ۲۴۳

بشیر صرفی کی نظموں میں کشمیر ایک مستقل موضوع ہے۔ ان کی منظومات میں سیاہی، سیاہ رات، غلامی اور سناٹوں جیسے الفاظ کی تہہ میں کشمیری غلامی اور مظلومیت کا عکس ڈھونڈا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر شفیق انجم رقمطراز ہیں:

> ان نظموں میں کشمیری مجاہدین کے ولولوں، قربانیوں اور شہادتوں کے تسلسل کو بشیر صرفی نے بڑی مہارت سے بیان کیا ہے۔ اس بیان میں کشمیر کے لیے ان کے خون میں شامل انت محبت بار بار اپنا تعارف کراتی ہے ساتھ ہی ساتھ اس نفرت کا اظہار بھی ان نظموں میں خوب ہوا ہے جو بھارتی فوجوں اور ان کے ظلم و ستم سے وابستہ ہے۔[۱۲]

"اشفاق وانی شہید" کے نام سے موسوم نظم میں انھوں نے اشفاق وانی شہید کی عظمت کو بڑے دل دوز انداز میں ہدیہ عقیدت پیش کیا اور یہ نوحہ بہن، ماں اور بیٹی کا ہے ان کو یقین ہے کہ ان مظالم اور جبر واستداد کی کوئی تو حد ہو گی کبھی تو ان شہیدوں کا لہو رنگ لائے گا کبھی تو یہ صبر اپنا اثر دکھائے گا اور صحن میں چمن میں بہار آئے گی۔

ماںتادار کی ٹہنی سے لپٹ کر بولے
آسماں مجھ پہ یہ ٹوٹا ہے کسی اور پہ ٹوٹے نہ کبھی
اپنے رخشندہ جبیں بھائی کی میت پہ پکارے ہمشیر
لحد کی خاک میں کیا خواب بھی دفنائیں گے
مرے ارمان بھلا ایسے ہی رہ جائیں گے
تب کہیں صحن چمن، صحن چمن صبحِ بہار آئے گی

بازوئے جبر کٹے

جسم سفاک بجھے

جسد بیداد گرے

تب کہیں ساعتِ صبر دل زار آئے گی

ص ۲۴۲

جدوجہد آزادی کی اس تحریک میں کشمیریوں نے جہاں اپنے پیاروں کے لاشے اٹھائے ہیں وہیں اپنے ارمانوں اور خوابوں کا لاشہ اپنے لیڈروں کی بدولت بھی اٹھایا ہے۔ کشمیر کے معاملے میں دھوکا دہی اور رہنماوں کے ہاتھوں لٹ جانے کی داستان بار بار دہرائی گئی ہے۔ بشیر صرفی اس معاملے میں خاموش نہیں رہے اپنی ایک نظم میں بڑی زہرناکی سے ان جھوٹے رہبروں کی شانِ رہبری کو بے نقاب کیا ہے جن کی بدولت حریت کی یہ کشمیری تحریک خود اپنے لوگوں کے ہاتھوں لہولہان پھرتی ہے۔

ہر اک معانی سے خالی خالی

یہ سارے جوہر خطابتوں کے تمام مفہوم سے تہی ہیں

یہ جوِش تقریر بے اثر ہے یہ سرد لفظوں کی اک جگالی

ہر اک معانی سے خالی خالی

جناب عالی

"کشمیری لیڈر اور تحریک آزادی" ص ۶۵۲

وہ واشگاف الفاظ میں واضح کرتے ہیں کہ کشمیری حریت کی تحریک میں دراصل رہبران نہیں بلکہ عوام الناس کا خون اور جوش شامل ہے جو اسے جاری رکھے ہوئے ہے عوام کی قربانیاں اور وطن کی آزادی سے محبت اس شعلہ حریت کو سرد نہیں ہونے دیتی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

وہ اور ہیں جو لہو سے اپنے وطن کی مٹی اجالتے ہیں
وہ صبح شہرِ الم کے خوگر، وہ شام غربت میں منور
اگرچہ سفاک ہیں ستم گر مگر ہے عزم ان کا کوہ پیکر
بہت فر وزاں مثالِ لالہ، شبوں میں صبحوں کو پالتے ہیں
کہ جن کی پیشانیاں ہیں روشن

امید انسان کو زندگی کرنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ کشمیری مسلمان بھی اسی امید کے سہارے جدوجہد آزادی میں سالوں سے بھارتی درندوں کی درندگی کا سامنا کر رہے ہیں اور اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر رہے ہیں کہ کبھی تو کشمیر آزاد ہو گا اور دنیا کے نقشے پر ابھرے گا اور کبھی تو کشمیر کا قریہ قریہ ہم سجائیں گے بشیر صرفی بھی اسی یقین اور امید کا عزم کیے ہوئے ہیں کہ کبھی تو یہ بے سکون وادی میں سکون کی فضا رنگ لائے گی اور یہاں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی اور ہمارا وطن آزاد ہو گا اور یہ سر زمیں مرکز صبر و اخوت ہو گی اور یہ سازشیں ختم ہو گی۔

مرے کشمیر کو اب بالیقین آزاد ہونا ہے
سکون نا آشنا وادی کو پھر سے شاد ہونا ہے
اسے اک قوم اب اقوامِ عالم میں بنانا ہے
مری آواز دل کو بیسہ بر فرہاد ہونا ہے
سجانا ہے ہمیں کشمیر کا ہر گوشہ و قریہ
وطن کا نقش رشک مانی و بہزاد ہونا ہے
زمانہ اس کی خوشبو سے مہک جائے گا پھر وانی
شہیدوں کے لہو سے اک چمن ایجاد ہونا ہے

"نغمہ آزادی" ص۲۵۵

مسلمان میں اللہ تعالیٰ نے ایک خصوصیت رکھی ہے کہ وہ تادیر غلامی کی زندگی کو برداشت نہیں کرتا کشمیری مجاہدین بھی اپنی سرزمین کو بھارتی درندوں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لیے مصروف عمل ہیں اور ان کے جذبہ ایمانی کی بدولت بھارتیوں کے لیے اس سر زمین پر اپنا تسلط اقائم رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

کشمیری مجاہدین گاہے گاہے بھارتی درندوں کی سفاکانہ سرگرمیوں کے خلاف اپنے جذبات کی عکاسی بشیر صرفی نے اپنی نظم ''کشمیری مجاہدوں کا ایک کامیاب مشن'' میں بھی کی ہے۔

اب عہد جبر و وفا کا انجام آن پہنچا
تمام صورت گرانِ نقش کا ہر نقش بے اثر ہے
کہ اب بصارت سے چشمِ دشمن بہت ہی محروم ہو گئی ہے
کہ قطرہ قطرہ اندھیروں کے موسمِ برشگال کے بعد
بر دنِ در بھی۔۔۔۔۔ دورنِ خانہ بھی
روشنی سی بکھر گئی ہے

ص ۲۵۴

نوجوان کسی بھی قوم کا روشن مستقبل ہوا کرتے ہیں اور قوم کے لیے سرمایہ افتخار ہوتے ہیں اور صبح نو کی نوید بھی یہی نوجوان ہوا کرتے ہیں۔ بشیر صرفی اپنی دھرتی کے مجاہدوں کو بڑے زبردست الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اپنی نظم ''کشمیری مجاہد'' میں رقم طراز ہیں۔

میرے کشمیر کے سارے کڑیل جواں
ہیں جو دھرتی پہ اِستادہ مانند کوہِ گراں
پھوٹتی ہے جبینوں سے ان کی نئی کہکشاں
آسماں کی صدائے دما دم کے زندہ نشاں

یہ نوجوان موت کے خوف سے بے خبر اپنی زندگی ہتھیلی پہ رکھے ہوئے ہیں یہ ارض پاک کے جیالے ہیں۔ شاعر انھیں صبح کے اجالے قرار دیتے ہوئے خیر کی دعا مانگتے ہیں۔

موت کی تال پر زندگی رقص میں
اور یہ سرشاریاں
دولتِ زہدانِ شب زندہ دار

ان کی بیداریاں

ارض کشمیر۔۔۔۔ ارض کشمیر کے ان جیالوں کی خیر

ان کے خون سے بکھرتی ہوئی صبح کے اجالوں کی خیر

"کشمیری مجاہدین" ص ۲۴۴

نظم "میرے غازی اور میرے شہید" اور "دم مست قلندر" میں بھی بشیر صرفی کشمیری مجاہدین کو خراج تحسین پیش کرتے اور ان کے حوصلوں کو بلند کرتے اور ان کے جذبہ ایمان کی تحسین کرتے نظر آتے ہیں۔ بشیر صرفی نے نظم "واپسی" میں اس کشمیری نوجوان کا عکس بیان کیا ہے جو اپنے مشن پر نکلتا ہے اور واپس شہید ہو کر آتا ہے اس کا چہرہ روشن، آنکھیں منور اور بدن کی رگ وپے میں ایک عجیب سی قوت اور طاقت موجزن ہوتی ہے اس کے جذبے اور ارادے صحرا کی وسعتوں سے بھی زیادہ عمیق ہے۔

وہ عزم کی دولت سے مالا مال اور حوصلے بلند ہیں جب وہ اس سفر پر نکلتا ہے تو اس کی نوجوان آنکھوں میں کسی کے خواب بسے ہیں اور کوئی اس کو الوداع کہنے کے لیے دروازے پر منتظر ہے مگر وہ شہادت کے جذبے کے تحت آگے بڑھتا ہے اور اس گلابی رومال کو دیکھتا ہے جو کسی نے وقتِ رخصت اس کے ہاتھ پر باندھا تھا وہ شہید ہوتا ہے اس کے ساتھی فتح یاب ہوتے ہیں اس نظم میں عزم، حوصلہ اور کرب کی کیفیت کو بھی بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

وہ پگڈنڈی پہ اپنے آخری قدموں پہ جب گھوما تو دیکھا

نیم وا در میں کھڑی وہ ماہ پارہ

اک اندازِ دعا میں ہاتھ ایستادہ کیے اور مضطرب سی تھی۔

مگر شوق شہادت اور آزادی کے جذبے اس مجاہد کو بلاتے ہیں

تب اس نے وہ اپنا وہ بازو

کہ جس پر اس پری رونے گلابی ریشمی رومال باندھا تھا

ہلا کر ایک سر گوشی کے عالم میں خدا حافظ کہا

پھر چناروں کے قریبی جھنڈ میں او جھل ہوا۔۔۔۔اس کو تو جانا تھا

"واپسی"ص ۲۵۰

بشیر صرفی مجاہدین کے جذبے اور کشمیر کے لیے دی جانے والی شہیدا کی قربانیوں پر نازاں ہیں۔مجاہدین کے عزم وحوصلے پر ان کو خراج تحسین بھی پیش کرتے ہیں وہ کشمیری لیڈروں سے سخت نالاں ہیں ان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

وہ اور ہیں جو لہو سے اپنے وطن کی مٹی اجالتے ہیں

وہ صبح شہر الم کے خوگر،وہ شام عزت میں ہیں منور

اگرچہ سفاک ہیں ستم گر،مگر ہے عزم ان کو کوہ پیکر

بہت فروزاں مثال لالہ، شبوں میں صبحوں کو پالتے ہیں ہے

ہے کتنی تاباں رہ شہیداں،ردائے رحمت لباس جان ہے

کہ ہے عزیمت ہر اک قدم پہ بدن پہ زنجیر کب گراں ہے

یہی تو ہے رسم جاں نثاراں،یہی ہے امید نوبہاراں

یہی نگار دل نگاراں کہ ہر عزم ان کا کراں کراں ہے

اس آب وگل کے جہاں سے گزرے،حیات ابدی انھوں نے پالی

جبکہ بشیر صرفی اپنی اس نظم "کشمیری لیڈر اور تحریک آزادی" میں کشمیری راہنماؤں کے کردار سے سخت خفا نظر آتے ہیں ان کے نزدیک یہ لیڈر اپنی سیاست چمکا رہے ہیں ان کے اندر جذبے کی کمی ہے اور

محض خطابت پر زور ہے۔ قوم کا حقیقی درد ان کے دلوں میں نہیں ہے ان کے الفاظ معانی کھو چکے ہیں محض کھوکھلے ہیں۔

ہر اک معانی سے خالی خالی

یہ سارے جوہر خطابتوں کے تمام مفہوم سے تہی ہیں

یہ جوشِ تقریر بے اثر ہے یہ سرد لفظوں کی اک جگالی

ہر اک معافی سے خالی خالی

جناب عالی

بہت ہے سج دھج سے، کروفر سے اہل جلسہ کی تالیوں سے

بظاہر عزت بھی تم نے پالی، مگر یہ دعوے، تمہارے وعدے

فقط بناوٹ، محض خیالی

جناب عالی

مختصرا یہ کہا جا سکتا ہے کہ بشیر صرفی نے کشمیر کے حوالے سے نظمیں لکھ کر اپنی زمین سے محبت اور گہری وابستگی کا ثبوت دیا ہے اور یہ کسی بھی فرد پر اس کی سرزمین کا حق ہوا کرتا ہے۔ بحیثیت شاعر بشیر صرفی نے اپنے اس فرض کو بخوبی نبھایا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب "رویے اور رجحانات"، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۳۷

۲۔ ابرار احمد، ڈاکٹر، مقدمہ "مزاحمتی ادب" مرتب رشید امجد، ڈاکٹر، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۵ء، ص ۴۸

۳۔ ایضاً، ص ۴۹

۴۔ htttps:// www.google. com/amp/s/ یا WWW. aikrozan. com

۵۔ رشید امجد، ڈاکٹر، کلام بشیر صرفی، مرتب، شفیق انجم، ڈاکٹر پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، بیک فلیپ

۶۔ صائمہ نذیر، ڈاکٹر، اردو غزل کے موضوعات کا تجزیاتی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، نمل ۲۰۱۴ء، ص ۲۱۴

۷۔ کلیم اختر، مضمون، کشمیری شاعری میں جذبہ حریت، بشمولہ، پاکستانی ادب، حصہ نثر، مرتبین، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر رشید امجد، اکادمی ادبیات، پاکستان، ۱۹۹۵ء، ص ۴۹۲

۸۔ اشرف انصاری سے راقمہ کی گفتگو، بمقام نمل اسلام آباد، بتاریخ ۲۰ فروری ۲۰۱۹ء، بوقت ۱۱:۰۰ صبح

۹۔ بشیر صرفی، دیباچہ نذرِ جاں، غیر مطبوعہ، ص ۴

۱۰۔ صلاح الدین درویش سے راقمہ کی گفتگو، بمقام نمل اسلام آباد، بتاریخ ۲۱ فروری ۲۰۱۹ء، بوقت ۱۰:۰۰ صبح

۱۱۔ اشرف انصاری سے راقمہ کی گفتگو، بمقام نمل اسلام آباد، بتاریخ ۲۰ فروری ۲۰۱۹ء، بوقت ۱۱:۰۰ صبح

۱۲۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، مقدمہ کلام بشیر صرفی، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۲۳

باب پنجم:

مجموعی جائزہ، نتائج وسفارشات

الف) مجموعی جائزہ:

تقسیم کے بعد بالخصوص ساٹھ اور ستر کی دہائی میں پاکستان کی سیاسی، سماجی معاشرتی صورت حال کے پیش نظر اردو شعر وادب میں ایک منظر ابھر آکر سامنے آیا۔ ابتدائی سالوں میں پاکستان میں آئین سازی نہ ہونے کی وجہ سے اول تو معاشرتی نظام میں اپنے ملک سے خرابیوں کی وجہ سے متعلق جو خواب وابستہ تھے ان خو ابوں اور تصورات کی تکمیل ہوتی نظر نہ آئی جس کے تحت روایت کے ساتھ ساتھ نئے مسائل جو اپنی سر زمین سے متعلقہ تھے شعرا نے اس مسائل کو موضوع بنایا اور مٹی سے محبت کا اظہار بھی کیا۔ نئے وطن سے متعلق خوابوں کے ٹوٹنے اپنے خدشات کو بھی بیان کیا۔ سیاسی لحاظ سے جب فقدان پیدا ہوا تو مارشل لا کو ان مسائل سے نپٹنے لے لیے موزوں سمجھا گیا جب کہ اس وجہ سے فکری سیاسی سطح پر مزید بحران پیدا ہوا اسی دور میں ادب میں تین نمایاں پہلو سامنے آئے بے سمتی، ذات کی گمشدگی، خارجی حقیقتوں، کے بجائے باطن میں پناہ لینا یہ تینوں پہلو ادب میں بہت دیر تک قائم رہے۔

علاوہ ازیں اس دور میں فنی اور انسانی مباحث کو تقویت ملی۔ لسانی سکیلات سے بھی اثر قبول کیا گیا جس کے تحت یہ کہا گیا الفاظ ایک ہی طرح اور ایک جیسے معنی میں استعمال ہونے کی وجہ سے اپنی تاثر کھو بیٹھے ہیں پھر فارسی انداز بیان کی تقلید نے بھی مزید ثقالت سے دوچار کر دیا ہے لہٰذا جیلانی کامران اور افتخار جالب اس ضمن میں پیش پیش تھے۔ جبکہ افسانے اور غزل میں فن کے بجائے موضوعاتی سطح پر نئے نئے رویے ضرور سامنے آئے۔ لیکن یہ رویے ہیت اور تکنیک کی سطح پر غزل اور افسانے کو زیادہ متاثر نہیں کر سکے جتنا کہ نظم کو کیا۔

بنیادی طور پر اس دور میں مایوسی، معاشی و معاشرتی عدم تحفظ خوابوں اور امیدوں کا ٹوٹنا جبر اور تشدد جیسے موضوعات ادب کا حصہ بنے۔ ساٹھ کی دہائی میں یہ موضوعات اس عہد میں ہمارے اپنے ماحول اور حالات کے تناظر میں بھی تھے جو اردو شاعری کا حصہ بنے۔ جدیدیت کے اس دور میں مغربی اثرات کا خاصا عمل دخل رہا ہے۔ جدید صنعتی ترقی اور مشینوں نے انسان کی اہمیت کو روند ڈالا اور وجودیت کی تحریک سامنے آئی۔ شناخت کا بحران پیدا ہوا۔ مغرب کی وجودیت اور دیگر رجحانات نے ہمارے ادب کو بھی متاثر کیا یوں اردو شعر و ادب میں جدیدیت کی تحریک کے تحت موضوعات میں تبدیلی اور بے پناہ وسعت پیدا ہوئی۔

سن ساٹھ تک سیاسی، معاشی عدم مساوات اور تشدد جیسے مسائل نمایاں تھے۔ سن ۷۰ء میں سقوط ڈھاکے واقعے نے ہماری نظریاتی اساس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا جس سے دو قومی نظریے کے حوالے سے سوال اٹھائے گئے شناخت کا مسئلہ در پیش ہوا۔ احساس شکست نے جنم لیا احساس زوال کا واقعہ ایک بڑی معنویت کا استعارہ بنا خوف اور بے سمتی کی فضا پیدا ہوئی ۱۹۶۵ء کی جنگ نے زمین کی اہمیت کے جذبے کو اجاگر کیا۔ دھرتی کے تحفظ سے متعلق نظریاتی بحثوں کا آغاز ۱۹۷۷ء کا مارشل لا اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال نے بے سکونی، عدم تحفظ اور منافقت کے رویوں کو ہوا دی جس سے مجموعی طور پر بے حسی اور مایوسی جیسے رویے اردو شاعری کا موضوع بنے۔

مجموعی طور پر ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں شاعری میں فنی و فکری دونوں سطحوں پر بے شمار تبدیلیوں ہوئیں اسلوب اور ہیت کے تجربے بھی ہوئے احتجاج اور مزاحمت کا اظہار بھی ہوا علامت کا استعمال بھی سامنے آیا الغرض ہر وہ موضوع ادب کا حصہ بنا جو سماجی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی سطح پر موجود تھا یارونما ہوا۔

بشیر صرفی بھی اپنے کلاسیکی مزاج کے ساتھ ان جدید رویوں اور رجحانات کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہمعصروں سے جدید رجحانات کے اثرات کو بھی قبول کیا۔ وہ راولپنڈی میں لکھنے والوں کی انجمن سے نہ صرف وابستہ تھے بلکہ اس کے سیکرٹری بھی رہے اس انجمن نے پوری دنیا میں نئے رویوں کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا جس کے زیر اثر بشیر صرفی کی شاعری کے موضوعات جدید دور کی فکر سے ہم آہنگ

نظر آتے ہیں۔بشیر صرفی کی شاعرانہ اساس میں اپنے عہد کا سیاسی و سماجی پس منظر میں موجود ہے۔دورں بینی، دوسری ذات کی تلاش جو اس دور کا مقبول موضوع تھا اس کا بیان بھی بشیر صرفی کی شاعری میں موجود ہے لیکن دوسری ذات کی تلاش کے سفر میں اپنے عہد سے دور نہیں جاتے۔

اگر بشیر صرفی کے کلام کا جائزہ لیں تو ان کی مذہبی شاعری ان تمام رائج عقائد و موضوعات کا احاطہ کر تی ہے جو عام مسلمان کے ایمان کا جزو ہو تا ہے ان کی مذہبی شاعری اس روایت کا تسلسل ہے جو اس ابتدائی اردو شاعری سے تشکیل پائی۔مذہبی شاعری کے بیان میں بے انتہا عقیدت کے زاویے ملتے ہیں جو حمد، نعت اور منقبت کے بیان میں استعمال ہوئے۔

بشیر صرفی کی شاعری میں غالب حصہ غزلیات کا ہے۔ان کی غزل فکری لحاظ سے جدت کے ساتھ ساتھ کلاسیکی مزاج کی حامل بھی ہیں گویا تخیل کی رنگینیوں کے ساتھ ساتھ زندگی کے حقائق بھی ہیں۔ان کا شعری رویہ غلامی اور جبر کے ماحول کو رد کرتا ہے۔عالمگیر تناظر میں حالات کی سنگینی کے تحت تنہائی کا احساس ان کا اہم موضوع ہے۔معاشرے میں موجود منفی رجحانات، اخلاقی سطح پر زوال، تحقیر آدمیت،اقدار کی پامالی، طبقاتی نظام، نفسا نفسی انسان کو دورں بینی کی طرف مائل کرتی ہے۔جدید انسان تنہائی کا شکار زیادہ ہو رہا ہے لہٰذا ان کی غزل کے موضوعات، خوف، ڈر، تنہائی، یاد، کرب، لاحاصل رشتوں کی بے تعلقی اور خارجی سطح پر جبر شامل ہے۔

جہاں تک جدیدیت کا تعلق ہے تو بشیر صرفی کے ہاں معروف معنوں میں جدیدیت موجود نہیں ہے لیکن موجودہ مسائل و مصائب کا ادراک ضرور موجود ہے۔وہ اپنے عہد کے سماجی و معاشرتی واقعات، ادبی مباحث اور جمالیات سے فرار حاصل نہیں کرتے ان کے افکار اپنی زمین اور ماحول سے ہی متعلق ہیں اکثر غزلوں میں کشمیر اور پریشان کن صورتحال پس الفاظ محسوس ہوتی ہے۔فنی سطح پر اگرچہ ا یہ سہ بہات و استعا رات یا صنعتوں کا استعمال زیادہ نہیں ملتا اور نہ ہی کنائیوں اور تشبیہات کا زیادہ عمل دخل ہے جہاں بھی ممکن ہو

اانہوں نے مناسب شعری محاسن سے حسن پیدا کیا البتہ ان کی کوئی غزل فارسی میں نہیں ان کے کلام میں فارسیت کی جھلک ضرور ملتی ہے۔ غزل بشیر صرفی کی پہچان کا ایک اہم حوالہ ہے۔

بشیر صرفی کی نظمیں بھی جدید عصری شعور کی نمائندہ ہیں نارسائی ان کی نظموں میں بنیادی اور اہم حوالہ ہے۔ انسانی خواہشات کا حصول سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی اقدار کا مطالبہ کرتا ہے۔ بشیر صرفی اس کے ناقد بھی ہیں اور تجریہ نگار بھی۔ ان کی نظم "احساس" اس کی بہترین مثال ہے۔ تنہائی کا غم میں احساس شکست جس ملال کو سامنے لاتا ہے۔ وہ بشیر صرفی کے جذبات کی شدت کو دہ چند کر دیتا ہے۔ جدید عہد میں اشیا کی طلب اور جذبے اور احساس کی کمی نے شعرا کو فکری سطح پر احتجاج پر آمادہ کیا۔ بشیر صرفی کے ہاں بھی احتجاج مختلف صورتوں میں نظر آتا ہے۔ جیسے "آدھی رات کا درد" اپنے غم کو بد روح سے مشابے قرار دے کر نجات کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ بعنوان "نظم" میں ایک تہذیب کی بربادی کا نوحہ ہے۔ جس میں رسوائی اور ذلت ہے لیکن کارواں کو اس ذلت کا احساس تک نہیں۔

"درد مشترک" میں جبر کا تسلسل ہے۔ خیر وشر کی آویزش، بے چارگی کا احساس، اقدار کی نفی، تشخص کی تلاش، اندھیرا اور سیاہی ایسی علامات ہیں جو ان کی تقریباً سبھی نظموں میں موجود ہیں۔ یہ علامات وموضوعات جدید حسیت کی بنا پر ہیں۔ بہر حال ان کی نظموں میں محض یاسیت ہی نہیں پائی جاتی بلکہ پر امید لب ولہجہ بھی ملتا ہے وہ جدید دور میں جدید انسان کی تمام تر اخلاقی شکستگی کے باوجود وہ مایوس نہیں ہیں۔ ان اندھیروں اور بے چہرگی کے ساتھ ساتھ مظاہر فطرت اور اچھی اقدار کو بھی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

ان کی نظموں میں داخلیت وخارجیت کا امتزاج ملتا ہے۔ بشیر صرفی کے ہاں مستعار علامات بھی نظر آتی ہیں۔ شجر، پیڑ اور شب کا استعارہ مختلف معنوں میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ فارسی الفاظ اور تراکیب کا استعمال بھی ہے۔ ان کے کلام میں فارسی تراکیب کی کثرت انہیں جدید اردو نظم کے دوسرے شعرا کے ساتھ جوڑتی ہے۔ جن میں فیض، راشد، مجید امجد کے ہاں بھی فارسی سے استفادے کا رجحان ملتا ہے۔ بشیر صرفی کے ہاں فارسی الفاظ وتراکیب بکثرت ملتے ہیں۔ جو کہ عام فہم ہیں ان کی نظموں میں بعض جگہ ترکیب در ترکیب

سازی کا عمل بھی ہے۔لیکن اس عمل سے ان کی نظم میں موسیقیت اور روانی بڑھتی ہے یوں جدت کے باوجود ان کی منظومات میں فارسیت کی جھلک روایت کے ساتھ فکری سطح پر جدید نظم کا مرتبہ بھی حاصل کرتی ہیں۔بشیر صرفی صنفی و اسلوبیاتی سطح پر کوئی بڑا تجربہ نہیں کر سکے لیکن جدید رویوں کے فروغ میں میں ان کا کردار بہر حال رہے گا۔

کشمیر سے وابستگی بھی ہمارے عصری ادب کا حصہ ہے۔کشمیر کے حوالے سے بشیر صرفی کے کلام کا خاصا حصہ موجود ہے"میرے غازی میرے شہید" اور کشمیری مجاہد کا ایک کامیاب مشن محض تاریخی شعور سے کام نہیں لیا گیا بلکہ اپنے کشمیری ہونے اور شناخت کے معدوم کیے جانے پر انہوں نے نوحہ بیان کیا۔غم کی شدت کے باوجود امید اور جذبہ موجود ہے۔

ان منظومات میں موجودہ الفاظ کی تہہ میں جیسے غلامی،سیاہ رات، مہیب سناٹوں میں مظلومیت اور غلامی کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔کلام بشیر صرفی میں کلام معلق اور کلام متروک کا حصہ بھی خاصا اہمیت کا حامل ہے۔وہ بھی ان کے منتخب کلام سے کسی طور بھی کم نہیں ہے۔معلوم نہیں انہوں نے کیوں اس کلام پر خط [illegible] کھینچا۔بہر حال مجموعی طور پر دیکھا جائے۔ تو بشیر صرفی کی شعری زبان میں اگرچہ فارسی اثرات موجود ہیں۔لیکن وہ غیر ضروری تراکیب اور اضافتوں سے گریز کرتے ہیں۔جدید لسانی پیرالہ موجود ہے۔عصری شعور سے بھی آگاہی ہے۔بشیر صرفی نے موضوعات اور اظہار دونوں حوالوں سے اپنے ہم عصر شاعروں کی آواز میں جو جدید اردو شاعری کو ایک آہنگ عطا کر رہی تھی اپنی آواز شامل کی۔بشیر کے معاصرین میں اعجاز راہی،رشید امجد، سرور کامران، نثار ناسک، شبنم مناوری، منشا یاد، منور ہاشمی،اشرف انصاری، نسیم سحر،ڈاکٹر توصیف تبسم شامل ہیں۔بشیر صرفی ایک سادہ، مخلص اور اخلاقی قدروں کے حامل انسان تھے۔انسانیت کے احترام اور رشتوں کے تقدس کو نبھانے کے قائل تھے۔ایک دوسرے کے حقوق کا پورا احساس رکھتے تھے اور انہی قدروں کو جو ان کی اخلاقی اساس تھیں۔معاشرے میں پھلتے پھولتے دیکھنا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ بے حسی، منافقت،خود غرضی اور حق تلفی جیسی منفی اقدار پر کڑھتے تھے اپنی شاعری کے ذریعے یہی پیغام دیا

جس میں کامیاب رہے۔بشیر صرفی ایک شاعر، دانشور، نثرنگار اور صحافی تھے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے فن کو علمی و شعری حلقوں میں متعارف کروایا جائے۔وہ ادب کی مثبت اور دائمی قدروں کے ساتھ وابستہ تھے اور کسی حلقہ ستائش باہمی میں شریک نہیں ہوئے اور نہ ہی انہوں نے نمود ونمائش یا شہرت کی پروا کی یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام ان کی زندگی میں طباعت پذیر نہیں ہو سکا۔وہ خاموشی سے لکھتے رہے اور خاموشی سے دنیا سے رخصت ہوگئے۔لیکن ان کا کلام اپنی کم نمائی کے باوجود اپنے عہد اوراردو شاعری کی روایت میں اہم مقام کا حامل ہے۔

ب۔نتائج

ا۔ بشیر صرفی کے کلام کے جائزے میں ان کی شخصیت کے سے حوالے جو بات سامنے آتی ہے وہ ان کی اپنے مذہب سے گہری وابستگی ہے۔سنی مسلک سے تعلق کی بناپر بزرگان دین سے عقیدت کا اظہار ان کی منقبت میں نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔گھریلو ماحول تربیت کی بناپر مذہب سے وابستگی اور فارسی زبان سے دلچسپی ان کی حمد اور نعت گوئی میں نمایاں نظر آتی ہے۔فارسی تراکیب کا استعمال بھی اہمیت کا حامل ہے۔

۲۔ بشیر صرفی کا کلام روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ عہد جدید کے نئے رویوں اور تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔انہوں نے اپنے دور کی جدید حسیت کے تحت قومی و بین الاقوامی سطح پر پیدا ہونے والی معاشی، معاشرتی، سیاسی صورتحال اور مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔

۳۔ بشیر صرفی کی شاعری کا اہم ترین زاویہ ان کا مزاحمتی رویہ ہے یہ مزاحمت صرف سقوط ڈھاکہ، مارشل لا یا کشمیر کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ معاشی تفاوت، انسان کی ناقدری، رشتوں میں منافقت، خود غرضی، مفاد پرستی، لاچارگی و بے بسی، انسان کی تنہائی ونارسائی، تہذیبی و اخلاقی اقدار کی نفی جیسے موضوعات کے حوالے سے ہر سطح پر مزاحمتی رویہ موجود ہے۔

۴۔ بشیر صرفی کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ کشمیری نژاد ہونے کی بنا پر اپنی مٹی سے محبت کے اظہار کے لیے ان کے کلام کا خاصا حصہ کشمیر کے موضوع پر ہے۔ کشمیر سے محبت اور کشمیر کو بھارتی تسلط سے آزاد کرانے کا جذبہ اور صبح نو کی نوید ان کے کلام میں موجود ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ جس وطن میں انہوں نے اپنا بچپن اور جوانی گزاری اور ان کی اولاد کا مستقبل بھی جس وطن (پاکستان) سے وابستہ تھا اس کی محبت میں صرف ایک نظم لکھی۔ پاکستان کی سیاسی صورتحال اور سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے ضرور اظہار خیال کیا ہے لیکن وہ جذباتی محبت و وابستگی جو کشمیر کے ساتھ نظر آتی ہے پاکستان کے ساتھ اس کا اظہار ایک ہی نظم بعنوان "پاکستان" میں ملتا ہے۔

۵۔ بشیر صرفی کے کلام کا غالب حصہ "غزل" پر مبنی ہے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزل کا مزاج کلاسیکی بھی ہے اور فکری اعتبار سے جدت کا عنصر نمایاں ہے۔

ج۔ سفارشات

میرا کام بشیر صرفی کی شاعری کی فکری جہتوں کو منظر عام پر لانا تھا علاوہ ازیں بیشتر صرفی کے کلام کی درج ذیل جہتوں میں کام کی گنجائش موجود ہے۔

۱۔ بشیر صرفی کی شاعری کے فنی پہلوؤں پر کام کی گنجائش موجود ہے اس سلسلے میں انکی حمد، نعت اور منقبت گوئی، غزل گوئی اور نظم نگاری کا اسلوبیاتی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ بشیر صرفی کا اپنے معاصر شعرا کے ساتھ تقابل کے حوالے سے بھی کام کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ بشیر صرفی اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد "ریڈیو پاکستان کراچی" سے وابستہ ہوئے بعد ازاں راولپنڈی ریڈیو پاکستان تھری میں بر سر پروڈیوسر کے عہدے پر بھی فائز رہے اس کے علاوہ وہ کالم نویس بھی تھے کچھ ڈرامے اور کچھ افسانے بھی لکھے ڈرامے پروڈیوس بھی کیے۔ کچھ اخبارات ورسائل کی ادارت

بھی کرتے رہے۔جن میں حرمت،اخبار وطن،ویو ویک اور افتخار ایشا شامل ہیں۔ریڈیو پاکستان پنڈی تھری میں کشمیر کے حوالے سے بھی پروگرام نشر کرتے رہے۔بشیر صرفی کے ان متفرقات کے حوالے سے بھی کام کی گنجائش موجود ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

مطبوعہ:

شفیق انجم، ڈاکٹر، مرتب، کلام بشیر صرفی، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء

غیر مطبوعہ:

بشیر صرفی، ڈائری شفق، مجموعہ، نظم اور غزل، غیر مطبوعہ، ترتیب، اگست ۱۹۸۹ء، مخزونہ جناب سجاد حیدر

بشیر صرفی، ڈائری اُجالا، مجموعہ، نعت، غیر مطبوعہ، مخزونہ جناب سجاد حیدر

بشیر صرفی، ڈائری نیم شب، مجموعہ، نظم اور غزل، غیر مطبوعہ، مخزونہ جناب سجاد حیدر

بشیر صرفی، دیباچہ نذرِ جاں، مجموعہ نظم بعنوان کشمیر، غیر مطبوعہ ڈائری، مخزونہ جناب سجاد حیدر

بشیر صرفی، ڈائری متاعِ حیات، مجموعہ نظم، غزل اور نعت غیر مطبوعہ، ترتیب، جون ۱۹۷۳ء، مخزونہ جناب سجاد حیدر

ثانوی ماخذ:

کتب:

ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر، جدید اردو ادبیات، فیروز سنز، لاہور، پاکستان، ۱۹۷۸ء

اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، ادارہ اشاعت اردو، حیدر آباد (دکن) ۱۹۴۳ء

اختر حسین رائے پوری، ادب اور زندگی، مطبع، انجمن ترقی اردو، دکن، ۱۹۳۵ء

جمیل ملک، ادبی منظر نامے، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲ء

رب نواز صوفی، مرتب و مولف، کنز العرفان، گھمکول شریف، کوہاٹ، س ن

رشید امجد،ڈاکٹر، پاکستانی ادب،رویے اور رجحانات، پورب اکادمی، اسلام آباد ۲۰۱۰ء

رشید امجد،ڈاکٹر، تمنا بے تاب، حرف اکادمی، راولپنڈی، ۲۰۰۳ء

رشید امجد،ڈاکٹر،(مرتب) مزاحمتی ادب،اکادمی ادبیات، پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء

رضا احمد،ڈاکٹر، اردو شاعری میں تصوف اور روحانی اقدار، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی،۲۰۰۷ء

رفیع الدین ہاشمی،ڈاکٹر،اصناف ادب،سنگ میل پبلیکیس .. مرلاہور،۱۹۶۷ء

رفیع الدین اشفاق،سید، اردو میں نعتیہ شاعری، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، اکتوبر،۱۹۷۶ء

روبینہ شہناز،ڈاکٹر، اردو تنقید میں پاکستانی تصورِ قومیت، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، اسلام آباد، طبع اول، ۲۰۰۷ء

سعادت سعید، اردو شاعری پر برصغیر کی تہذیبی روایت، غضنفر اکیڈمی، کراچی،۱۹۹۵ء

سلیم اختر،ڈاکٹر، رشید امجد،ڈاکٹر (مرتبین)، پاکستانی ادب،(حصہ نثر)، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، پاکستان ۱۹۹۵ء

شارب ردولوی، پروفیسر، تنقیدی مباعث غزل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۱۹۹۵ء

صباحت قمر، (مترجم)، رومانیت (ایک تنقیدی اصطلاح) دستاویز مطبوعات، لاہور، مارچ ۲۰۰۴ء

علیم صبانویدی، مدراس ناڈو میں نعت گوئی، مرتبہ ڈاکٹر، جاویدہ حبیب، مدراس ناڈو اردو پبلی کیشنز چنائی،۲۰۰۴ء

فرخندہ لودھی، رومان کی موت، دستاویز مطبوعات، لاہور،۱۹۹۷ء

محمد خان اشرف،ڈاکٹر، اردو ادب (تنقیدی و تحقیقی مطالعہ)، الوقار پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۳ء

محمد حسن،ڈاکٹر، اردو ادب میں رومانوی تحریک، کاروانِ ادب صدر، ملتان ۱۹۹۳ء

مسعود حسن رضوی، ادیب، روح انیس، کتاب گھر، لکھنو،۱۹۷۳ء

عبدالنعیم عزیزی،ڈاکٹر، اردو نعت گوئی اور فاضل بریلوی، از، ادارہ تحقیقات امام احمد رضا انٹرنیشنل، کراچی، پاکستان، ۲۰۰۸ء

مولوی محبوب عالم (مرتب)، اسلامی انسائیکلوپیڈیا، ترتیب و تدوین، سید عاصم محمود، الفصیل ناشران و تاجران کتب، لاہور، س ن

نفیس اقبال، ڈاکٹر، اردو شاعری میں تصوف (میر، سودا اور درد کے عہد میں) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

وحید الزمان، مولانا، القدوس الوحید، ادارہ اسلامیات پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۰۱ء

وقار احمد رضوی، ڈاکٹر، تاریخ جدید اردو غزل، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، طبع اول، ۱۹۸۸ء

رسائل / جرائد:

ماہنامہ افتخار ایشیا، شمارہ، ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۱ء، راولپنڈی

لغات

آکسفورڈ ڈکشنری، اورینٹل بک سوسائٹی، لاہور، ۲۰۰۰ء

مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید، قاسم نسیم امرہوی، سید، آغا محمد باقر، مرتبین نسیم الغات (اردو)، غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء

نور الحسن (مولف)، نور اللغات، جلد چہارم، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء

مقالات:

الف۔ د۔ نسیم، اردو شاعری کا مذہبی و فلسفیانہ عنصر، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۰ء

صائمہ نذیر، اردو غزل کے موضوعات کا تجزیاتی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، نمل، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء

عارف حسین، پاکستانی اردو غزل میں مذہبی استعارے، تحقیق و تجزیہ، مقالہ برائے ایم فل اردو، نمل، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

خطوط:

ارشد معراج، ڈاکٹر، رابطہ بذریعہ ڈاک، موصولہ خط، ۱۰ مارچ، ۲۰۱۹ء

انٹرویو:

اشرف انصاری سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام نمل، بتاریخ ۲۰ فروری ۲۰۱۹ء، بوقت ۱۱ بجے صبح

اطہر وانی سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام ہیڈ لائٹ ٹاؤن راولپنڈی، بتاریخ ۱۰ جنوری ۲۰۱۹ء، بوقت ۱۰ بجے رات

حفیظ وانی سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام ہیڈ لائٹ ٹاؤن راولپنڈی بتاریخ ۲۵ جنوری ۲۰۱۹ء، بوقت ۵ بجے شام

ڈاکٹر رشید امجد سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام رہائش گاہ، گلستان کالونی، راولپنڈی، ۴ جنوری ۲۰۱۹ء، بوقت ۵ بجے شام

سجاد حیدر سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام نمل بتاریخ، ۲ جنوری ۲۰۱۹ء بوقت، ۹ بجے صبح

فہمیدہ بانو سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام جی/۱۳، اسلام آباد، بتاریخ ۲۶ دسمبر ۲۰۱۸ء، بوقت ۶ بجے شام

منور ہاشمی سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام وفاقی اردو یونیورسٹی اسلام آباد، ۴ فروری ۲۰۱۹ء، بوقت ۱۰ بجے صبح

نسیم سحر سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام ہیڈ لائٹ ٹاؤن راولپنڈی بتاریخ ۸ جنوری ۲۰۱۹ء، بوقت ۵ بجے شام

نگہت بشیر سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام جی/۱۳، اسلام آباد، ۲۶ دسمبر ۲۰۱۸ء، بوقت ۶ بجے شام

وقار عزیز سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام رہائش گاہ صدر راولپنڈی ۳۱ جنوری ۲۰۱۹ء، بوقت شام ۷ بجے

انٹرنیٹ:

https://minhajsisters.com/urdu/tid/45080/

http:// www.google.com.pk/search?

www.tajdaregolra.com/

Pir-Mehr-Ali-Shah-Golra-Sharif.html

www.aikrozan.com

https:// www.google.com/amp/s